اچھے افسانے

مائل خیرآبادی

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پان والا

"برگِ سبز است تحفۂ درویش"

پان والے کی دوکان پر موٹے موٹے اور سبز و سرخ چمکدار حروف میں لکھا ہوا "برگِ سبز است تحفۂ درویش" کا سائن بورڈ دیکھ کر میں ٹھٹکا "برگِ سبز اور پان" کی نسبت میں وہ ادبی لطف آیا کہ میرے قدم خود بخود دوکان کی طرف اُٹھ گئے۔ میں سوچتا جا رہا تھا کہ یہ شاعرانہ تخیل ایک پان والے کو کیسے سوجھا؟ ممکن ہے کہ جس طرح شیخ سعدیؒ نے ایک تربوز بیچنے والے کو "من قماش فروشم دلِ صد پارہ خوشیم" بتا دیا تھا، شاید اسی طرح لکھنؤ کے کسی سعدیؒ نے اس پان والے کو برگِ سبز کا نسخہ بتا دیا ہو

بہر حال میں دوکان پر پہنچا۔ دوکان پر ایک آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ میں نے اکنی چٹکی میں دبائی، پان والے کی طرف بڑھائی، کہا "بھئی، دو پان دینا!" آواز سن کر وہ میری طرف متوجہ ہوا، اکنی لیتے وقت آنکھیں چار ہوئیں "ایں ظفر صاحب!" کہہ کر پان والا دوکان سے کود پڑا اور میرے گلے لپٹ گیا۔ میں حیران تھا کہ یہ کون ہے؟ جو اس بے تکلفی سے لپٹ گیا۔ بھلا مجھ سے اس سے کبھی شناسائی کیا رہی ہوگی، وہ بھی اس بے تکلفی کی۔ میں علی گڑھ کا گریجویٹ اور سرکاری نائب تحصیلدار، اور یہ پان والا!

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھنے والا دیکھ تو نہیں رہا ہے جو میرے متعلق نہ جانے کیا کیا خیال کرے؟ دو تین منٹ تک پان والا نہایت گرمجوشی کے ساتھ مجھے سینے سے لگائے رہا، لیکن میری طرف سے سرد مہری اور فرار کی کیفیت محسوس کرکے بولا "ظفر! شاید تم نے اپنے حبیب کو نہیں پہچانا۔"

"ایں! حبیب! تم اور پان کی دوکان؟" میں نے یقین نہ آنے والے انداز میں کہا۔ اس نے دوکان پر بیٹھے ہوئے لڑکے سے کہا: "دوکان بند کردو اور گھر آؤ، میں چلتا ہوں۔"

پھر میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک طرف لے چلا، راستے میں میں نے پھر کہا۔ "تمہیں یہ سوجھی کیا؟ گریجویٹ ہو کر پان بیچنے بیٹھے، کہیں ملازمت نہیں ملی تھی تو میرے پاس چلے آتے میں پیشکاری میں رکھ لیتا۔ مانا تنخواہ کم ہوتی مگر اوپر کی آمدنی، جانتے ہو، کتنی ہوتی ہے؟ اللہ کی دین ہے اور کیا کہوں؟"

میں خدا جانے کیا کیا جھینکتا رہا۔ حبیب سنجیدگی سے سن رہا تھا۔ میرے کسی کسی فقرے پر زیرِ لب مسکرا دیتا۔ جب میں اس کے پیچھے ہی پڑ گیا تو اس نے کہا "بھائی! سب کچھ عرض کروں گا، گھر تو چلو۔"

تھوڑی دور چل کر اُس کا مکان آ گیا۔ ہم دونوں کمرے میں بیٹھے حبیب کا ملازم لڑکا حسن بھی آ گیا۔ حبیب ابتدائی خاطر مدارات میں مشغول تھا اور میں اس کی علمی تباہی کا مرثیہ پڑھ پڑھ کر اسے کوس رہا تھا بار بار یہی اعتراض میری طرف سے ہو رہا تھا کہ "گریجویٹ ہو کر پان بیچنا علم کی سب سے بڑی توہین ہے پھر ایک سیّد زادے کو تو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔"

خاطر اور تواضع کے بعد جب حبیب بیٹھا تو کہنے لگا "پیارے دوست! پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ ایم اے کرنے کا میرا بھی ارادہ تھا لیکن والد بزرگوار کی اچانک بیماری اور موت نے میری تمام اسکیم خاک میں ملا دی۔ والد صاحب کی تنخواہ کی

بدولت میرے گھر کی زندگی تھی اور اسی تنخواہ کے ایک حصّے پر میری تعلیم کا بھی انحصار تھا۔ والد صاحب کی بیماری نے گھر کا اثاثہ ختم کیا اور ان کی موت نے ہمیں معاشی زندگی کی فکر میں مبتلا کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ بی اے کرنے کے بعد جب میں گھر آیا ہوں تو پھر یونیورسٹی کا رُخ نہیں کیا۔

ایک لطیفہ اور سناؤں میرے والدین کی دیرینہ تمنا تھی کہ اپنی زندگی ہی میں میرے سر سہرا دیکھتے۔ نہ معلوم والد صاحب کو کس طرح احساس ہو گیا کہ وہ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکیں گے۔ ایک دن والدہ سے کچھ باتیں ہوئیں، اور "چٹ منگنی پٹ بیاہ" لیجئے ہمارے گھر میں ایک شخص کا اور اضافہ ہو گیا۔ مسکراتے کیا ہو؟ میرا بھی یہی خیال تھا کہ اس وقت شادی کی کیا تُک ہے، مگر بھائی ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ والد بزرگوار نے بہو کو دیکھ لیا پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

والد کے انتقال سے مجھ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں یونیورسٹی میں بہترین کھلاڑی تھا۔ فٹ بال، ہاکی، کرکٹ، باسکٹ بال وغیرہ کھیلوں میں پیش پیش رہا یہ صحیح ہے کہ میں کتابی تعلیم میں کسی سے پیچھے نہ تھا اور باتیں بنانے میں تو میرا جواب ہی نہ تھا۔ لیکن یہ چرب زبانی اور کتابی تعلیم دھری کی دھری رہ گئی۔ جب انتہائی کوشش کے باوجود کہیں ملازمت نہ ملی، اور جب والدہ صاحبہ نے ایک دن کہا "بیٹا! کل کھانے کو نہیں ہے"۔ تو عمر میں پہلی بار "پیر تلے کی زمین سرکنے"، کے معنے سمجھ میں آئے اور عمر میں پہلی بار "والد" کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔

نئی نویلی بیوی کے سامنے جاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی۔ اس عمر میں کس کو اچھا پہننے اور اچھا کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ مہینوں گھونگھٹ نہیں اُٹھتا۔ میں سوچ رہا تھا آخر میری بیوی بھی تو اسی دنیا کی ایک عورت ہے، میں اُس کے سامنے جاتا تو جھینپتا ہوا۔ جب اس سے بات کرتا تو خِفت کے ساتھ۔ سچ کہتا ہوں ظفر، میں نے اپنی بیوی کو ایک چھلّا تک بنوا کر نہیں دیا

تھا۔ مگر واہ! شریکِ حیات ہو تو ایسی کیا مجال جو کبھی شکایت کی ہو۔

ایک دن جب میں ملازمت کی تلاش میں دن بھر مارا مارا پھر کر ناامید واپس ہوا تو یہ ارادہ کر لیا کہ بس ایک نظر ماں اور بیوی کو دیکھ لوں اس کے بعد شب کی اندھیری میں بیکار تعلیم یافتہ نوجوان کی اس سنت کو زندہ کروں جو وہ ریل کی پٹری کے نیچے ادا کرتے ہیں۔ یہی جذبات لے کر گھر آیا۔ جو کچھ روکھی روٹیاں گھر پر تھیں، انھیں خوشی خوشی دنیا کی آخری نعمت سمجھ کر کھایا، پانی پیا۔ پھر جب سب اپنی اپنی جگہ سو رہے تھے، میں گھر والوں کو سوتا سمجھ کر تقریباً بارہ بجے اپنی چارپائی سے اٹھا۔ عین اسی وقت رشیدہ چونکی، مجھے گھبرایا ہوا اُٹھتے دیکھ کر بولی۔

"خیریت ہے، جی کیسا ہے؟"

چور کا دل ہی کتنا ہوتا ہے، میں اُٹھتے اُٹھتے پھر چارپائی پر گر گیا۔ رشیدہ میرے پاس آئی بولی "اس وقت کچھ گھبراتے ہوئے معلوم ہوتے ہو، کیا بات ہے؟ میں نے کہا" کچھ نہیں اچھا تو ہوں، ہاں نیند نہیں آ رہی ہے"۔ کہنے لگی "مجھے معلوم ہے کہ آپ کو نیند کیوں نہیں آ رہی ہے"۔ میں نے کہا "معلوم ہونے کی خوب کہی۔ میرا حال کسی سے چھپا تو ہے نہیں، اب تو کچھ اور ہی ارادہ ہے"۔ اس نے پوچھا۔ اب کیا ارادہ ہے"۔ میں نے کہا "خودکشی"۔

ہائیں! تم خودکشی، مسلمان اور حرام موت۔ یا اللہ!" میں نے جواب دیا "رشیدہ! کیا کروں؟ اللہ بھی تو مدد نہیں کرتا، رزق کے دروازے اُس نے ہم پر بند کر دیئے تو اب سوائے خودکشی کے چارہ ہی کیا ہے"۔

میری یہ بات سن کر رشیدہ نے کہا کہ "کیا رزق کا ایک ہی دروازہ اللہ نے بنایا ہے" جس کا نام پڑھے لکھے لوگوں نے ملازمت رکھ لیا ہے اور ملازمت بھی وہ جو اپنی خودداری کو بھینٹ چڑھا کر خوشامد اور چاپلوسی کے بل پر حاصل کی جائے۔ یا رشوت یا کسی کے دباؤ کے اثر سے ملے۔ پھر اگر کسی نہ کسی طرح مل بھی جائے تو جب تک اپنے افسر کی جا و بے جا ہاں میں ہاں نہ ملائی جائے، جب تک صحیح و غلط کے امتیاز کو ختم کر کے افسر کی خوشنودی اپنا ایمان

نہ بنا لیا جائے اس کا نبھانا ممکن نہیں۔ وہی ملازمت جو انسان پر انسان کو خدائی کے کرتب سکھائے اور اسی کے نہ ملنے پر یہ سمجھ لیا جائے کہ بس اللہ تعالیٰ نے رزق کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں۔ مجھے حیرت تو یہ ہے کہ جو "غیرت مند" زمانے کی کشمکش سے گھبرا کر اپنے جسم کی خودکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں ان کی وہ غیرت اس وقت کہاں چلی جاتی ہے جب وہ اپنے جسم کے اندر کے اس شریف انسان کو خوشامد چاپلوسی جھوٹ، فریب، غلامی کے دھاردار زہریلے تیروں سے چھید چھید کر اپنے ہاتھوں قتل کر دیتے ہیں جس کا نام ضمیر ہے۔ میں تو اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ آپ ہنوز انتہائے سعی کے باوجود ملازمت کی لعنت سے بچے ہوتے ہیں"۔

یہ رشیدہ کی پہلی طویل گفتگو تھی۔ ورنہ اس سے پہلے، جی، جی ہاں، اچھا، ہوں، اور ہاں کے علاوہ پورا فقرہ تک میں نے اس کی زبان سے نہیں سُنا تھا۔ رشیدہ کی اس گفتگو سے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر کا سویا ہوا انسان جاگنے کے لیے کروٹ بدلنے کو ہے میں نے کہا "رشیدہ اس میں شک نہیں کہ تم نے نہایت خوبصورتی سے ملازمت کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی تو رکھ دی، مگر یہ نہ بتایا کہ میں کروں کیا؟ تم دیکھتی ہو کہ میرے گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ اس عمر میں کون نہیں چاہتا کہ چار پیسے ہوں تو ذرا دل کے ارمان نکلیں، مجھے اپنے ارمانوں کا تو خیر اتنا خیال نہیں، لیکن تمہیں ان پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھتا ہوں تو میرے ضمیر کی کمزوریاں بار بار خودکشی پر اکسانے لگتی ہیں"۔

"آپ نے پھر خودکشی کا نام لیا، آپ خودکشی کا تو تصور ہی ... وہ بھی میری وجہ سے آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ مجھے آپ کے گھر میں تکلیف ہے۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ رُوکھا سُوکھا کھانے پہننے کو مل جاتا ہے پھر مجھے قرآن مجید کی وہ آیت کسی آن نہیں بھولتی جو بے سہاروں کے لیے بہترین سہارا ثابت ہوتی ہے۔ کاش کہ آپ عربی سے واقف ہوتے تو سن کر ... جد میں آ جاتے، دیکھیے ترجمہ ہی کتنا حوصلہ افزا ہے۔ فرمایا کہ "جو کوئی اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ اس کے لیے کوئی راہ پیدا فرمائے گا اور اس کو ان طریقوں سے روزی پہنچائے گا جو

اُس کے وہم و گمان میں نہ ہوں۔"

رشیدہ نے اتنا کہہ کر مجھ پر نگاہیں گاڑ دیں، شاید وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی تقریر کا مجھ پر کیا اثر ہوا ہے ظفر! اُس وقت میری حالت اس طالب علم کی سی تھی جس کے اپنے مطالعے کی کوششیں سلب ہو گئی ہوں اور وہ ماسٹر کی پڑھائی کے رحم و کرم پر رہ گیا ہو۔ تمہیں یاد ہے ظفر! جب پروفیسر مجیب صاحب نے ایک دن کہا تھا کہ طالب علموں کو اپنے پیر پر کھڑے ہونا چاہیے اور میں نے برجستہ کہا تھا کہ پیروں پر کھڑے ہونے سے بہتر ہاتھوں پر کھڑا ہونا ہے اور جب مجھ سے اس کی تشریح کرائی گئی تو میں نے ہاتھوں پر کھڑے ہونے کے کیا کیا معنی پہنائے تھے۔ اور پھر مدتوں یونیورسٹی میں یہ کہاوت یوں مشہور ہو گئی تھی کہ طالب علموں کو اپنے ہاتھوں پر کھڑا ہونا چاہیے۔" لیکن رشیدہ کے سامنے میری ساری منطق طاقِ نسیاں ہو گئی تھی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح پھر کہا،

"رشیدہ! پھر آخر میں کیا کروں؟"

"کوئی چھوٹا موٹا روزگار کر لیجیے!"

"لیکن روزگار کے لیے پیسے کی ضرورت ہے اور یہاں اللہ کے نام کے سوا کچھ نہیں!"

"اللہ کے نام کے سوا اور چاہیے کیا؟ میں آپ کو چند ٹکوں کا روزگار بتاؤں!"

"بتاؤ!"

"پان کی دوکان رکھ لیجیے۔"

"پان کی دوکان!" میرا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "آہ! میری قیمت تمہاری نظر میں یہ ہے رشیدہ!"

"آپ کی قیمت؟" — رشیدہ نے فوراً جواب دیا "آپ کی قیمت تو میری نظر میں یہ ہے کہ اگر اللہ و رسول منع نہ کرتے تو میں آپ کو سجدہ کرتی۔ لیکن آپ فرمائیں

کہ پان کی دوکان کرنے سے آپ کو وحشت کیوں ہو رہی ہے۔ ملازمت کرنے رشوت لینے میں کوئی عار نہیں، افسر کی جا و بے جا اطاعت میں کوئی جھجک نہیں بلکہ فخر محسوس کرنا۔ لیکن عزّت پر حرف اس میں آتا ہے کہ اپنے قوتِ بازو سے حلال روزی کمائی جائے۔ مدّت ہوئی علاّمہ اقبال کا ایک شعر سنا تھا جو کچھ اس طرح سے تھا کہ "لقمہ صالح ترا صالح کند" آپ تو اقبال کے بے حد مدّاح ہیں۔ برائے خدا آپ مجھے بتائیں کہ اقبال کا "صالح مرد" وہ ہے جو حرام لقمے سے اپنے خون کو گندلا کرے یا حلال روٹی کے سوکھے ٹکڑے کھا کر اس شعر پر جھوم جھوم جائے ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ظفر میاں! شاید تم ہنس پڑو، روشن خیالی کی وہ تمام گرماگرمی کافور ہوگئی جو یونیورسٹی کی پیداوار ہوتی ہے سچ کہتا ہوں رشیدہ کے اس انداز نے میرے اندر کے سوئے ہوئے انسان کو جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ مجھے اپنی رگوں میں نیا خون دوڑتا محسوس ہوا، مجھے اپنے بازوؤں میں نئی طاقت اُبھرتی معلوم ہوئی لیکن تم جانو ماحول کا اثر آسانی سے انسان کو اپنی حدود سے نکلنے نہیں دیتا۔ میں نے دبے ہوئے الفاظ میں کہا "مجھے تو پان بنانے آتے بھی نہیں" بولی "اونھ، پان بنانے نہیں آتے، جیسے یہ بھی کوئی ایسا کام ہے جس کے سیکھنے کی ضرورت ہو، اللہ کا نام لے کر ایک ذرا سی جگہ میں بیٹھ جایئے۔ انتظام سب میرے ذمّے۔ بس آپ یہ کیجئے کہ پان پر کتھا، چونا پوت پات کر گاہک کو دے دیجئے اور گلوری بنانا کوئی کمال تو ہے نہیں چٹکی بجاتے آتا ہے۔ اے لیجئے"

یہ کہہ کر رشیدہ نے اپنا پاندان گھسیٹا، پان بنایا لپیٹ کر مجھے دیا۔ میں نے مسکرا کر واقعی مجھے اس وقت ذرا ہنسی آگئی تھی میں نے مسکرا کر پان لیا اور کہا "استاد یہ تو سب ٹھیک ہے مگر ہمّت نہیں پڑتی"۔ کہنے لگی ہمت وِمت تو سب پڑتی ہے بس ذرا بگڑے ہوئے ماحول سے بھڑنے اور لڑنے کی ضرورت ہے میں دعوے کے ساتھ کہتی ہوں کہ اگر آپ پان کی دوکان کرلیں تو آپ بے روزگاری کے اس قلعے کو فتح کرلیں گے جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا، اخبار

درسائل اور تقریروں میں بے روزگاری کے خلاف ڈھول پیٹنا اور بات ہے، اور کرکے دکھانا اور بات ہے۔ آپ کے پان کی دوکان کرتے ہی دوسرے وہ تمام نوجوان چھوٹے چھوٹے پیشوں کی طرف جھپٹ پڑیں گے جو اس وقت اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے خودکشی کی سوچ رہے ہوں گے۔ مانا کہ شروع شروع میں کہیں "آہا، آپ اور پان کی دوکان!" مگر یقین جانیں اگر تیسرے ہی دن خود آپ سے مشورہ نہ کریں تو میری زبان کاٹ لیجئے گا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کتنے نوجوانوں کی زندگی آپ کے اس معمولی اقدام سے سنور جائے گی اور اس تقدم کا ثواب اللہ تعالیٰ آپ کو عنایت فرمائے گا۔"

ظفر! سنا تو تم نے بھی ہے کہ ایک ایرانی نے عورت کے ادنیٰ اشارے سے پہاڑ کھود ڈالا تھا۔ لیکن اس چودھویں صدی میں ایک مسلمان سیدانی کو ایک پیشے پر مرد کو ابھارتے نہ سنا ہوگا۔ مجھے بڑی حیرت تھی کہ یہ میری وہی بیوی ہے جس کی زبان سے "جی اور جی نہیں" سے زیادہ میں نے نہیں سنا تھا۔ آج جو زبان کھلی "تا مرد سخن نہ گفتہ باشد" کی پوری تفسیر بن گئی۔ میں نے ہار مان لی۔ رشیدہ سے وعدہ کرلیا۔ مذاق نہیں سچ مچ وعدہ کرلیا۔ اور جس ہمت اور جوش کے ساتھ وہ رات بسر کی دوسرے دن اسی جوش کے ساتھ ایک پٹارے میں دو ایک ڈھولی پان، کتھے چونے کی کلھیاں اور چھالیوں کی ڈلیہ رکھ کر اپنے خیال میں جہاد کرنے روانہ ہو گیا۔ میں تم کو یہ بھی بتادوں کہ یہ دو ڈیڑھ روپے کا سامان بھی رشیدہ نے اپنے پاس سے منگواکر مجھے گویا عنایت فرمایا تھا۔

دیکھئے آپ پھر مسکرا رہے ہیں۔ ارے بھئی اُس دن ساری دنیا مجھ پر ہنس رہی تھی۔ "آہا، حبیب صاحب! السلام علیکم۔" "اوہو، آپ ہیں حضرت!!!" "بھئی کام تو خوب ہے مگر زیب نہیں دیتا۔" یہ، اور اسی قسم کے جملے میرے گرد و پیش سے چست کیے جا رہے تھے۔ اور میری یہ حالت تھی کہ گو پان بنانا نہیں آتا تھا مگر جیسے تیسے لپیٹ لپاٹ کر دیتا جا رہا تھا۔ شام کو جب اٹھا ہوں تو جیب اکنی دونی اور پیسوں سے بھری تھی۔ جا کر رشیدہ کی

گود میں چھن سے ڈال دیئے۔ وہ بیٹھی چھپ چھپ سروتہ چلا رہی تھی۔ اپنے آگے ریزگاری پڑی دیکھ کر مجھ کو دیکھنے لگی۔

دوسرے دن پھر میں نے پان فروشی کی۔ دوسرے دن پھبتیوں اور آوازوں کی وہ زورازوری تو نہ تھی مگر کچھ بھولے بھٹکے کسی کسی وقت آ آکر فقرہ چُست کر جاتے تھے۔ ہفتہ عشرہ کے بعد جب کوئی اس قسم کی بات کہتا تو میں خود اس کی ذہنیت پر ہنستا تھا۔ دیکھا ظفر تم نے! ہفتہ عشرہ میں کیا سے کیا ہو گیا میں، اور یہ اس لیے کہ دراصل چوتھے روز مشتاق نے چائے کی دوکان رکھ لی تھی، اور ساتویں روز ریحان نے پھل بیچنا شروع کر دیئے تھے۔

وہ سائن بورڈ، جس نے تم کو میری دوکان کی طرف کھینچا، تیسرے مہینے میں نے بنوایا تھا اور اس کی بنوائی میں پچیس روپے خرچ کیے تھے۔ ان ذرا ذرا سے کاموں میں اللہ نے وہ برکت دی ہے کہ میں کیا عرض کروں، پہلے ہی رمضان میں حساب لگایا تو حیرت ہو گئی۔ شاندار دوکان کے علاوہ اتنا روپیہ رشیدہ کی بکسیا میں تھا کہ پچیس روپے زکوٰۃ کے نکالے، مکان کی مرمت کرائی، گھر بھر کے کپڑے بنوائے، حسن کو اپنی مدد کے لیے دوکان پر رکھ لیا پندرہ روپے ماہانہ اسے دیتا ہوں اور والدہ صاحبہ، جنھوں نے میری اس دوکان سے اختلاف کیا تھا۔ اب ان کا یہ عالم ہے کہ ہر نماز کے بعد رشیدہ کی درازیٔ عمر کی دعا کرتی ہیں اور جب کوئی ان کی عمر کی خاتون آکر اپنی بہو کی برائی کرتی ہے تو میری امی جان رشیدہ کو گلے لگا لیتی ہیں۔"

ظفر! یہ ہے "برگِ سبز است تحفۂ درویش" کی داستان جس دن چاہتا ہوں دوکان جاتا ہوں جس دن جی چاہتا ہے سیر کرتا ہوں، کسی کا غلام نہیں، کسی کی دھونس نہیں۔ آزاد پیشہ، بس ایک اللہ کا ڈر ہے جس نے مجھے توفیق بخشی کہ اکلِ حلال کی طرف متوجہ ہوں۔ ملازمت میں یہ مزے کہاں۔ تم تو واقف ہی ہو، بھگت ہی رہے ہو گے۔"

حبیب نے اپنی آپ بیتی ختم کر دی میں نے سن کر لمبی سانس لی۔ دل کی بات تو یہ ہے کہ مجھے حبیب کی زندگی پر رشک آ رہا تھا۔

میں مزدور نہیں ہوں

"پگلی! کیوں اپنے کو گناہ گار کر رہی ہے؟ کیوں اپنی زندگی خراب کرتی ہے؟ دیکھ! جس اللہ نے یہ زبان دی ہے وہ اس سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کا حساب لے گا۔ حکیم صاحب کو اپنی زندگی کا حساب دینا ہوگا، تجھے اپنا، تو کیوں انھیں کوس کوس کر اپنا ثواب کھو رہی ہے۔"

یہ اور اسی طرح رمضانی اپنی بیوی بدلیا کو سمجھاتا۔ لیکن بدلیا ایک جاہل عورت تھی پھر ساتھ ہی گرم مزاج اور تیز زبان بھی شوہر کی زبان سے یہ نصیحت سن کر وہ اور چراغ پا ہو جاتی، اس کے مزاج کا پارہ اور چڑھ جاتا۔ وہ جھنجھلا کر جواب دیتی:

"تمہارے سینے میں دل نہیں، پتھر ہے پتھر، تم کیا جانو "ماتا" کسے کہتے ہیں، کسی ماں کے دل سے پوچھو، جو لُٹ چکی ہو، سیروں ملیدہ بنا بنا کر میں نے درگاہ کی نذر کیا، ایک نہیں، شہر کی ساری مسجدوں کے طاق بھر ڈالے۔ کون سی چوکھٹ مجھ سے چھوٹی، مدار بابا کے یہاں میں نے حاضری دی، وہ دن تم کو یاد ہوگا جب میں پیدل "داتا پیر" کے مزار پر گئی تھی۔ یاد کیوں نہ ہوگا تم نے تو روکا تھا۔ یہ بھی دھمکی دی تھی "اگر وہاں گئی تو طلاق دے دوں گا" مگر میں گئی! اپنا زیور بیچ کر گئی، اپنے پیروں گئی۔ ہائے تم کو کیسے سمجھاؤں تم کو نہ جانے کس نے کیا پڑھا دیا۔ ہائے اللہ!

لیکن میرے دکھوں کو دیکھنے والے نے دیکھا جس کا سایۂ ولیوں" پر رہتا ہے اُس نے میری سُن لی اور پھر جب چاند سا بیٹا ہمیں ملا تو تمہاری نظریں بھی اسے دیکھنے سے نہ تھکتی تھیں۔ اس کھلونے سے رات دن کھیلا کرتے تھے۔ ہائے غارت ہو جائے حکیم جس نے میرے بچے کو کھا لیا۔ شطرنج کھیلتا رہا اور میرے لال کی نبض پر انگلی تک رکھنے نہ آیا۔ میں نے گھر کی بچی کھچی پونجی اس کے آگے رکھ دی۔ بلک بلک کر اس کے سامنے روئی لیکن اس بے رحم نے شکور سے کہا "نکال دو اس عورت کو" نہ دی اُس نے اپنی بنائی ہوئی "دوا" اور کھیلتا رہا شطرنج، ظالم کہیں کا، بے رحم۔ اور تم ہو کہ اس کی طرفداری کرتے ہو۔ میرا بس چلے تو پھونک دوں اُس کے گھر کو اور دیکھ لینا میری بددعائیں بے کار نہ جائیں گی۔ میرے دل سے ہوک اٹھتی ہے، میرا کلیجہ کٹ گیا ہے، میں روؤں گی، کوسوں گی، کھا جاؤں گی حکیم کو، اور اور..."

بدلیا کی یہ بدزبانی اور طراری دیکھ کر رمضانی کبھی تو گھر سے چلا جاتا کبھی چادر تان کر لیٹ جاتا، اور کبھی پھر جرأت کر کے سمجھاتا۔

"بدلیا! موت اور زندگی نہ حکیم کے ہاتھ میں ہے نہ کسی پیر اور ولی کے۔ یہ سب اللہ کی مشیت ہے۔ میں زیادہ تو پڑھا لکھا نہیں جو تجھے سمجھاؤں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ دھن، دولت، اولاد جو کچھ وہ اپنے بندوں کو دیتا ہے، یہ سب اس کی امانت ہے۔ اس نے ایک امانت ہمیں دی، یہ اس کی مہربانی۔ اس نے اپنی امانت واپس لے لی، یہ بھی اس کی مہربانی۔ فکر تو اس کی ہونی چاہیئے کہ اس کی امانت کی حفاظت میں ہم نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ جو آخرت میں پکڑ ہو اور ہم کچھ جواب نہ دے سکیں، تم ہی سوچو، بچے کے دانت نکل رہے تھے۔ دانت نکلنے میں بچوں کو جو تکلیف ہوتی ہے اس کو وہ ہی جان سکتے ہیں۔ بے زبان بتائیں کیا؟ ہاتھی ایسے بچے چار دن میں ناتواں ہو جاتے ہیں۔ دست آنا شروع ہوئے کہ جان پر بن گئی۔ تم نے پہلے تو میری کچھ سُنی نہیں، تعویذوں اور گنڈوں کے پیچھے پڑی رہیں، مزاروں کے چکر میں رہیں، صحیح طریقے سے علاج نہیں کیا۔ جب سب کچھ کر کے تھک گئیں

تو حکیم کا سہارا پکڑا۔ بھلا یہ سب کیا کرتے اندھی کوٹھڑی میں ٹٹولنے والے، کچھ ہاتھ لگ گیا، بس آپے سے باہر ہو گئے۔ اللہ کا شکر تو ادا نہیں کرتے، ڈینگ مارتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ موت پر قابو پالیا

میں یہ نہیں کہتا کہ حکیم کو پہلے دکھاتیں تو بچہ بچ جاتا۔ ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ ہاں ایسی آزمائشوں میں ایمان کا کھو دینا سب سے بڑا نقصان ہے۔"

ایمان کا نام سن کر بدلیا بھڑک اٹھتی، وہ کہتی "تم تو بے دین ہو گئے ہو، نہ جانے اسی کا وبال ہو جو اللہ نے ہم سے ہماری دولت چھین لی تمہارے نزدیک تو سارا قصور میرا ہے اور یہ حکیم تو تمہارا!۔۔۔"

"بس کہلواؤ نہ زیادہ!!۔۔"

اس طرح بدلیا کو روتے اور کوستے مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہو گیا اب سنئے! اللہ کی قدرت حکیم صاحب کا دو تین برس کا بچہ کھیلتے کھیلتے کنویں کی جگت پر پہنچ گیا۔ کنوئیں میں جھانکا تو اسی میں جا رہا ایک کہرام مچ گیا، محلے بھر کے لوگ عورتیں، بچے اور مرد سبھی اکٹھا ہو گئے۔ حکیم کی بیوی بغیر برقعہ، بے پردہ، ہائے میرا لال کہتی ہوئی گھر سے بدحواسی میں نکلی، مگر بے بس "کنواں پاپی، اور جن بابا کا قبضہ" ہر ایک اپنی جگہ دم بخود کھڑا ہو گیا۔ حکیم صاحب کی بیوی دیوانی ہوئی جا رہی تھی، اسے لوگوں نے پکڑ رکھا تھا۔ بدلیا نے بھی سنا تو وہ چمک اٹھی" دیکھا! یہ ہے غریب کی آہ!" رمضانی حقّہ پی رہا تھا اسے ٹوک کر بولی" دیکھا! بدی کا بدلہ، اب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔"

رمضانی نے حقے کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے ایک اچٹتی نگاہ بیوی پر ڈالی۔ شور بھی سنا، حقہ چھوڑ کر ادھر کان کیے۔ کنوئیں کی طرف سے ایک چیخ "ہائے میرا لال" اس کے کان میں پڑی۔ اس نے لپک کر صحن میں پڑی ہوئی مونج کی رسی اٹھائی اور دوڑ پڑا۔ بدلیا تنک کر بولی" کہاں چلے؟" لیکن رمضانی جا چکا تھا۔

لوگ کنوئیں سے دور کھڑے لینا لینا کر رہے تھے، ایک طرف حکیم صاحب بھی گھبراتے ہوئے" ارے کیا ہوا، ارے کیسے؟" کہتے چلے آ رہے تھے" پاپی کنواں" "جن بابا" کا نام سن کر وہ بھی جھجکے۔ لیکن سب نے دیکھا کہ رمضانی بجلی کی طرح کنوئیں پر آیا۔ رسی کھنٹے سے باندھی اور اس

کے سہارے کنوئیں میں اتر گیا۔ تو ہم پرست خلقت کے سامنے ایک پردہ تھا کہ رمضانی کی اس جرأت نے چاک کر دیا۔ اب سبھی کنوئیں کے قریب آ گئے تھے۔ دوسرے لمحے رمضانی بچے کو ایک ہاتھ سے رسی پکڑے ہوئے پیروں کی انگلیوں کے سہارے کنوئیں سے نکلا۔ بچہ بے ہوش اور رمضانی لت پت، اس نے ایک سرسری نگاہ مجمع پر، اور ہنستی ہوئی نظر حکیم صاحب پر ڈالی۔ پھر بچے کو ماں کی گود میں دے دیا۔ پھر؛۔

پھر یہ کہ وہ کسی سے بات کیے بغیر اپنے گھر چل دیا۔ بہت دیر کے بعد نہ جانے حکیم صاحب کے دل میں کیا خیال آیا۔ وہ رمضانی کے جھونپڑے کی طرف چلے قریب پہنچے تو سنا ایک نسوانی آواز چیخ چیخ کر کسی پر برس رہی تھی "نکال آئے سانپ کے بچے کو، بڑا ثواب کمایا، بڑا احسان کیا۔ اب نام بھی اونچا ہو جائے گا۔ تمہارا اپنا بچہ، ہائے میرا لال اب زندہ ہو کر آ جائے گا۔ حکیم روپے پیسے سے گھر بھر دے گا لعنت ہے اس کے پیسے پر۔ اب بیٹھے ہاتھ سینک رہے ہو، اپنے بچے کے لیے یہ تیزی دکھائی تھی کبھی؟ مونج کی رسی، ہاتھ چھلیں گے نا تو اور کیا ہو گا....."

حکیم صاحب نے سمجھ لیا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ وہ اور قریب گئے ایک مردانہ آواز سنی؛
"بدلیا! میں نے کسی لالچ میں یہ نہیں کیا۔ میں نے صرف اللہ کی خوشی کے لیے یہ کیا ہے اگر وہ قبول کر لے تو شائد آخرت میں میری ہمت پڑے کہ تیری اس زبان درازی کے لیے بھی "مالک" کے حضور کچھ کہہ سکوں ورنہ....."

رمضانی اپنی بات ختم نہ کر سکا تھا کہ حکیم صاحب اُس کے قدموں پر آ گرے۔ رمضانی بڑبڑا گیا۔ بولا "ارے حکیم صاحب! توبہ میری، آپ اور میرے قدموں پڑتے ہیں۔ کیوں آپ مجھے گناہ گار کر رہے ہیں؟"

اس منظر کو بدلیا نے بھی دیکھا، اور ان لوگوں نے بھی دیکھا جو جھونپڑے کے آس پاس رہتے تھے۔ دیر تک حکیم صاحب معافی مانگتے رہے۔ آخر انہوں نے اپنی کوتاہی کا اقرار کر کے بدلیا کو بھی منا لیا۔ مغرور اور بدلہ لینے والے جذباتی انسان کو جب خوراک مل جاتی ہے تو اس کا غصہ غصہ نہیں

رہتا ایک فتح مندانہ نظروں کی چمک بن جاتا ہے۔ بدلیا سینہ ٹھونک کر بولی:۔

”جائیے حکیم صاحب! میں نے معاف کیا میرے خدا نے معاف کیا۔“

اب حکیم صاحب رمضانی کی طرف پھر متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ اس کے ہاتھوں کے چھل جانے سے جو خون بہہ رہا تھا ہنوز کم نہیں ہوا تو ایک شخص کو اشارہ کیا کہ فلاں دوالے آئے اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر رمضانی کے قدموں میں ڈال دیا۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور وہ کچھ نہ سمجھ سکے جب رمضانی نے جواب دیا:

حکیم صاحب! میں مزدور نہیں ہوں۔“

رمضانی کے اس فقرے کو حکیم صاحب نے بھی سُنا، آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے بھی سُنا اور رمضانی کی بیوی بدلیا نے بھی سُنا۔ کس پر کیا اثر ہوا؟ یہ تو بڑی لمبی بات ہے۔ ہاں بدلیا کے متعلق معلوم ہے کہ اس کے بعد بدلیا وہ بدزبان بدلیا نہ رہی جو چند لمحہ پہلے تھی، اُس نے اپنے منہ میں لگام لگالی تھی اور رات دن اِس کوشش میں لگی رہتی تھی کہ جس جگہ اس کا شوہر کھڑا ہے وہیں خود بھی جا کھڑی ہو۔

نیکی برباد

محبوب کے ساتھ اس نے بڑے احسانات کیے تھے۔ ڈیڑھ سال لگاتار کوششیں کر کے اور اپنا سیکڑوں روپیہ پھونکنے کے بعد اسے ایک سنگین مقدمہ سے نجات دلائی تھی۔ اس مقدمہ کے بعد جب محبوب بالکل خالی ہاتھ اور بے دست وپا ہوگیا تھا تو اس نے اُسے اپنی دوکان پر رکھ لیا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں جب محبوب کاروبار سے واقف ہوگیا تو اسے ایک چھوٹی سی دوکان کرادی۔ مزید برآں یہ کہ محبوب اپنی خانہ آدی کیلیے بھی مشکور ہی کا مرہونِ مِنّت تھا۔ ان احسانات کا تقاضا تھا کہ محبوب اس کا پورا پورا وفادار ہوتا۔ جہاں تک زبان کا تعلق تھا، محبوب اس میں پورا اُترا۔ وہ جب بیٹھتا مشکور کے گن گاتا۔ زبان کی پوری قوت کے ساتھ قصیدہ خوانی کر کے اپنی وفاداری کا یقین دلاتا چنانچہ جب ڈاکٹروں نے مشکور کے پرانے بخار کو تیسرے درجے کی دِق تشخیص کیا اور مکمل آرام کے لیے پہاڑ جانیکا مشورہ دیا تو مشکور نے محبوب کو بلایا، اُسے اپنے کاروبار کا حساب سمجھایا اور نینی تال چلا گیا۔ وہاں وہ بیس جون تک رہا۔ ۲۰ رجون کو جب وہ نینی تال سے واپس ہو رہا تھا تو اپنے اندر بے حد نشاط محسوس کر رہا تھا۔ پہاڑ کی صحت بخش ہوا نے اسے نئی

زندگی بخشی تھی اسے امید ہو چلی تھی کہ اب اگر سلامت روی کے ساتھ زندگی کے دن گذارے تو موسمِ سرما میں بیماری کی طرف سے بے فکر ہو جائے گا۔

اس نے اپنی واپسی کی اطلاع محبوب کو ایک ہفتہ پہلے دے دی پھر جب وہ چلا تو تار بھی دیا۔ اس کا خیال تھا کہ محبوب اسے خوش آمدید کہنے اسٹیشن پر ضرور آئے گا، مگر اس کی نگاہیں پلیٹ فارم کا جائزہ لے کر ناکام واپس آئیں۔" شاید محبوب کو تار نہ ملا ہو" مشکور نے دل میں کہا اور تانگہ کر کے گھر کو روانہ ہو گیا۔

گھر آکر اُس نے سُنا کہ محبوب نے نہایت خاموشی سے دوکان کا سارا سامان ایک شرنارتھی کے ہاتھ اونے پونے بیچ ڈالا اور پرسوں اپنے بال بچوں سمیت کہیں چمپت ہو گیا۔ یہ خبر سُن کر مشکور کو چکر آگیا۔" آہ نیکی کا زمانہ نہیں" اس کی زبان سے بڑے غمگین اور اندوہناک لہجے میں نکلا اس نے اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کی، مگر اس نے محسوس کیا کہ جیسے کسی نے اس کی پنڈلیوں کی رگیں پکڑ کر کھینچ لی ہیں اور پیروں تلے کی زمین سرکی جا رہی ہے۔ اُس نے ایک دیوار کا سہارا لیا تا کہ گر نہ پڑے، مگر وہ دیوار بھی اُسے ہلتی ہوئی معلوم ہوئی وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا۔

اس خبر سے اس کے دل میں مستقل اندیشے پیدا ہو گئے، وہ معاشی مسئلے کو اب کیسے حل کرے گا جب کہ دق جیسے مُہلک مرض کا شکار ہے۔ اور اگر یہ مسئلہ حل نہ ہوا تو ۔۔۔ ؟ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ شام کو جب مسرت اس سے ملنے آیا تو اس سے مشورہ کیا۔ مسرت اس کا رشتہ دار تھا مسرت قلمی آموں کے ایک باغ کی آمدنی سے اپنی زندگی خوشی خوشی گزار رہا تھا۔ آموں کے باغ کی اسکیم مشکور ہی نے اسے سجھائی تھی اور کچھ نقد رقم سے امداد بھی کی تھی۔ مشکور نے اُس کے سامنے آئندہ پریشانیوں کا نقشہ کھینچا۔ مسرت نے ہر طرح امداد کا وعدہ کیا لیکن جب اٹھ کر گیا تو وہ اللہ کا بندہ پھر مشکور کے پاس نہیں گیا اور مشکور اس کے گھر گیا تو ظالم گھر میں موجود تھا لیکن کہلوا دیا کہ گھر پر نہیں ہے۔

مسرت کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ ذکی کے پاس گیا ایک وقت تھا جب ذکی مشکور کے ساتھ مل کر فرم چلا رہا تھا۔ جب تک کام ساجھے میں چلا تعلقات بڑے خوشگوار رہے اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مشکور نے فرم کے کام کو گویا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا، اور نہایت دیانت داری کے ساتھ پیسے پیسے کا حساب رکھا۔ کام بڑھا تو باہمی مشورے سے بٹوارہ کرلیا اور دونوں اپنی اپنی جگہ اپنا کام کرنے لگے۔

تجارت کا کام چاہے جتنے سرمائے سے کیا جائے، وقت بے وقت اس میں قرض لینے کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ ذکی اور مشکور ایسے وقتوں پر فراخ دلی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے مگر آج جب مشکور ذکی سے ملا اور اپنی موجودہ حالت اس کے سامنے رکھی تو ذکی نے بتایا اس کا اپنا روزگار بھی بڑی تیزی سے ٹھپ ہو رہا ہے اُسے سنبھالنے کے لیے وہ خود سرمائے کی تلاش میں ہے ذکی نے سوچا کہ مشکور کو ہزار دو ہزار تو الگ رہے سو دو سو بھی دے دیئے گئے تو واپسی کی امید نہیں۔

اسی طرح مشکور اپنے کئی دوستوں اور رشتے داروں کے پاس گیا جن پر کسی وقت اس نے احسانات کئے تھے۔ لیکن ہر ایک نے خود اپنی مجبوری اور پریشانی کا اظہار کیا اور بعض نے تو صاف انکار ہی کر دیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر مشکور حیران بھی ہوا اور پریشان بھی حیرانی اسے یہ ہوئی کہ کیا نیکی کا بدلہ یہی ہے، اور پریشانی یہ کہ اب ہوگا کیا؟ وہ تن بہ تقدیر گوشہ نشیں ہو گیا۔ جو کچھ سوپچاس روپے اس کی جیب میں تھے انھیں کھایا پیا، اس کے بعد گھر کا سامان بکنے لگا جب سامان ختم ہو گیا تو مکان فروخت کرنے کی نوبت آگئی اور پھر مرض کا جو حملہ ہوا تو اب کی بار اس نے کمر ہی توڑ دی۔ دوستوں اور رشتے داروں کی بے وفائی اور مسلسل افکار نے اسے سخت چڑچڑا بنا دیا تھا۔

اسی حال میں ایک دن وہ کسی گہرے سوچ میں تھا کہ اس کا ایک پرانا ساتھی ضمیر

اس سے ملنے آیا۔ ضمیر اس کا بہت پرانا ساتھی تھا، بچپن کا ساتھ کھیلا ہوا۔ سنِ شعور کے بعد بھی اس سے کچھ دنوں گاڑھی چھنتی رہی۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ ضمیر رخصت ہو کر کہیں گیا تو دس برس کے بعد آیا۔ مشکور اپنی اس تباہ حالی میں اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا، مگر ضمیر جو دس برس کے بعد آیا تھا بغیر ملے کیسے واپس جاتا؟ ملاقات ہوئی اور خوب دل کھول کر ملاقات ہوئی مشکور نے اپنی آپ بیتی بڑے دردناک لہجے میں سُنائی۔ آخر میں فیصلہ کن انداز میں کہا، "نیکی اور احسان کا زمانہ نہیں ہے۔"

"ہے کیوں نہیں"۔ ضمیر نے برجستہ جواب دیا۔

"تمہارے لیے ہوگا۔ میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔"

"تمہارا تجربہ دلیل تو نہیں۔"

"خوب! میرا تجربہ کوئی تجربہ ہی نہیں؟ اچھا مظفر کی بیوہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں آپ۔ بے چاری شادی کے دو سال کے بعد بیوہ ہو گئی۔ تین مہینے کا بچہ گود میں تھا۔ کس طرح محنت مزدوری کر کے، کوٹ پیس کر، سلائی کر کر کے بچے کو پالا پوسا۔ اپنا خون پلا پلا کر جوان کیا۔ بچہ اٹھارہ برس کا ہوا، ماں خوش تھی کہ جس پودے کو سینچا ہے وہ بڑھ کر سایہ دار ہوا ہے، اب اس کے سائے میں بیٹھے گی۔ بیٹا نامراد پرسوں پاکستان بھاگ گیا۔ کہیے احسان اور نیکی کا زمانہ ہے؟ اور سنیے کن ارمانوں سے حافظ امام علی صاحب نے بیٹے کی شادی کی تھی۔ تم تو تھے نہیں، ہزار ڈیڑھ ہزار آدمیوں کو دعوت دی تھی۔ بہو کو بیٹی سے زیادہ چاہتے تھے۔ سب کچھ بہو کے سپرد کر دیا۔ بہو ایسی ظالم نکلی کہ سب کچھ لے کر حافظ صاحب کو شوہر سے لڑا دیا اور پھر شوہر کو لے کر میکے جا رہی۔ اب بیچارے حافظ صاحب مسجد میں مُلّاگیری کرتے ہیں۔ احسان اور نیکی کا زمانہ ہے؟ اور مثالیں دوں؟"

"یہ مثالیں ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ مگر سب کے پیچھے حماقت کارفرما ہے۔"

"یہ حماقت ہے؟ چشم دید واقعات ہیں، اور تم حماقت کہتے ہو۔"

"حماقت تو ہے ہی۔"

"کیسے ؟"

"سنو ایسے ۔ دنیا میں جب کوئی شخص کسی کے ساتھ یہ سوچ کر احسان کرتا ہے کہ وقت پڑنے پر وہ بھی اس کا بدلہ چکائے گا تو ایسے محسن کو یہی روحانی کوفت اور شکایت ہوتی ہے جو تم کو ہے ۔ اور ایسے شخص کو یہ شکایت ہونا بھی چاہیے ۔ لیکن جس کے سامنے اللہ کی رضا اور فرض کی ادائیگی ہوتی ہے وہ نیکی اور احسان اس لیے کرتا ہے کہ آخرت میں اس کا اجر پائے گا چاہے کوئی احسان کا بدلہ دے یا نہ دے اُسے کوئی غم نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ یقین رکھتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اللہ کسی احسان کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ۔ اللہ کو خوش کرنے کے لیے ایسا بندہ نیکی پر نیکی کرتا چلا جاتا ہے ۔"

ضمیر کا یہ انکشاف مشکور کے لیے ایک نیا انکشاف تھا اس نے کہا ۔" تو میں نے لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا سب ضائع ہو گیا ۔"

"بالکل" "تم خود اس کا رونا رو رہے ہو ۔

یہ سُن کر مشکور نے سر جھکا لیا ۔ وہ سوچنے لگا ، اب کیا کرے ؟ دق کا مارا ہوا انسان مجبور اور معذور ۔۔ !!"

اپنے مرکز کی طرف

میں یکدم چونک پڑی۔ "طوفان!" میری زبان سے نکلا اور میں بدحواس ہو کر "کپتان۔کپتان" پکارنے لگی۔ سمندر کے بے پناہ تلاطم میں ہمارا جہاز اس طرح بے قابو ہو رہا تھا جیسے سیلاب میں کوئی پتہ ہو۔ پانی کی موجیں بادلوں کی طرح بار بار اٹھتیں اور جہاز سے ٹکراتیں۔ جہاز اُن کے زبردست تھپیڑوں سے ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ ہمیں ڈر تھا "اب ڈوبا، اب ڈوبا" جہاز کے مسافر اور سارے ملازم بوکھلائے ہوئے تھے۔ میں اپنے کپتان کی تلاش میں کبھی عرشے پر جاتی، کبھی ڈیک کی طرف اور کبھی اوپر پہونچتی۔ سمندر کے اس طوفان میں جہاز بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ ایسی حالت میں جہاز کے پرانے ملازموں کے پیر بھی جم نہ سکے تھے پھر میری کیا حیثیت تھی۔ میں جگہ جگہ گری اور کئی بار زینوں سے ٹکرائی۔ ایک جگہ جب کہ میں ایک زینے پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک ملازم ہتھوڑا ہاتھ میں لیے میرے پاس سے گزرا اس نے مجھے دیکھا میرا بازو پکڑا پھر خود سنبھلتا اور مجھے سنبھالتا مسٹر مائیکل تک پہنچا دیا۔ جہاز بھر میں مسٹر مائیکل ہی ایسے تھے جو اب بھی سنجیدگی کے ساتھ زینے کا ایک تختہ پکڑے کھڑے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے۔ میں جا کر ان سے لپٹ گئی۔ "ڈارلنگ! اب کیا ہوگا؟"

جہاز کے کپتان مسٹر مائیکل میرے شوہر تھے۔ انھوں نے مجھے سنبھالا۔ اس کے بعد اپنے اسسٹنٹ سے بولے "مسٹر نلسن! دو جہاز ہماری کمک کو آرہے ہیں مگر مجھے امید نہیں کہ وہ بروقت ہم تک آسکیں۔ ہمارا جہاز بالکل بے قابو ہو گیا ہے اور اس کے غرق ہونے میں کوئی زیادہ دیر نہیں ہے۔ ہماری تمام کوششیں بیکار ہو چکی ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ مسافروں کو لائف بیلٹ تقسیم کر دیئے جائیں اور کشتیاں اتار دی جائیں۔"

مسٹر نلسن نہایت محنتی اور اطاعت شعار اسسٹنٹ تھے۔ انہیں اپنے افسر سے بیحد حسنِ ظن تھا۔ مسٹر مائیکل کی زبان سے یہ مایوس کن جملے سن کر وہ ایک طرف چلے۔ ابھی وہ چند ہی قدم چلے تھے کہ اچانک مسٹر مائیکل نے گھبرا کر کہا۔ "مسٹر نلسن، مسٹر نلسن!! جلدی کیجئے۔ بہت جلدی ہمارا جہاز پہاڑ کی زد میں آگیا۔"

جہاز کا سائرن پوری قوت سے بول رہا تھا۔ میں نے کہا "ڈارلنگ! تم نے اپنے کو بچانے کی فکر کر لی؟" مسٹر مائیکل مسکرائے بولے "ڈیر ایلن! جہاز کا کپتان اپنے کو بچانے کی فکر سب سے آخر میں کرتا ہے۔" اس کے بعد اس نے ایک بہترین لائف بیلٹ نکالا۔ مجھ سے کہا "لو یہ تمہارے لیے میں نے ریزرو کر رکھا تھا۔ روح القدس تمہاری مدد کریں، آؤ آخری بار تم سے مل لوں۔!!"

"ڈارلنگ۔!" میں نے پکارا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ خبر نہیں۔ ہوش آیا تو اپنے کو ایک کمرے میں پلنگ پر لیٹے ہوئے پایا۔ عین اس وقت جب میں نے آنکھ کھولی۔ ایک نرس انجیکشن کی سوئی میرے بازو سے نکال رہی تھی۔ اس نے مجھے ہوش میں آتے دیکھا تو خوش ہو کر بولی "اب آپ خطرے سے بالکل محفوظ ہیں!" اس نے گھنٹی بجائی گھنٹی کی آواز سنتے ہی کئی عورتیں کمرے میں آگئیں۔ اُن کے چہروں سے خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ سب تیمارداری میں لگ گئیں۔ سب کی سب ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی عورتیں تھیں کوئی ایسی نہ تھی جسے جوان کہا جا سکے۔ میرا خیال ہے، چالیس سے کم کوئی نہ تھی۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔

جس روز میرا غسلِ صحت ہوا۔ اُس دن ان عورتوں نے بڑی خوشی منائی۔ ایک مختصر

سی تعارفی پارٹی مجھے دی۔ اس پارٹی میں بیس پچیس خواتین شریک تھیں۔ انھوں نے مختصر تمہید کے بعد میرا حال پوچھا میں بتاتی ہی کیا ؟ کہہ دیا "ایلین میرا نام ہے مشہور جہازراں مسٹر مائیکل کی بیوی ہوں جہاز ایک طوفان میں تباہ ہوگیا۔ سمندر کی موجوں نے شاید ادھر ساحل پر مجھ کو پھینک دیا اور آپ مجھے اٹھالائیں۔ اس کے سوا میری زندگی میں نہ کوئی دلچسپی ہے نہ عبرت۔ کیا اچھا ہو کہ آپ سب بہنیں مجھے بتائیں، کہ میں کہاں ہوں اور آپ کون ہیں ؟ اور یہاں کی معاشرتی اور تمدنی حالت کیا ہے ؟ آپ نے جس خلوص کے ساتھ میری تیمارداری کی، اس کی میں بیحد ممنون ہوں۔"

میرے یہ دریافت کرنے پر تمام عورتوں کی نگاہیں ایک بوڑھی عورت کی طرف اٹھ گئیں۔ اس بوڑھی عورت نے کہا "بیٹی ! دو تین روز صبر کرو۔ اتوار کو ہمارا ایک بہت بڑا اجتماع ہونے والا ہے۔ تم کو بھی شریک کیا جائے گا۔ اُس میں تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون ہیں ؟ ہمارے کیا عزائم اور منصوبے ہیں ؟ ہاں تم سر دست یہ جان لو کہ اس وقت خطِ استوا کے قریب جزیرۂ عورستان میں ہو۔"

"عورستان — عجیب و غریب نام ہے" میں نے حیرت کا اظہار کیا اور خاموش ہو رہی۔ اور اس کے بعد اجتماعِ عورستان کی کارروائی کا انتظار کرنے لگی۔

دوسرے ہی دن سے انھوں نے اجتماع کی تیاری شروع کر دی۔ میں اب ٹہلنے جانے لگی تھی۔ بیکاری میں مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے اپنا شاندار اور تابناک ماضی یاد آرہا تھا جس کی جدائی سے میں بیحد تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ جی بہلانے کی خاطر میں نے درخواست کی کہ اجتماع کی تیاری میں کوئی خدمت مجھے بھی دی جائے۔ نہایت خوشی سے یہ بات مان لی گئی۔ کارڈ کے برابر کاغذ کے ٹکڑے میرے آگے ڈھیر کر دیئے گئے۔ اور کہا گیا ان پر جس قدر لکھ سکو یہ فقرہ خوش خط اور جلی حروف میں لکھ دو۔

"نئی تہذیب — مردہ باد"

میں نے بڑی محنت اور مستعدی سے یہ کام شروع کیا۔ اتوار تک میں نے سینکڑوں کی تعداد میں یہ فقرہ لکھ ڈالا۔ اتوار کے دن دو بجے ایک عورت نے آکر مجھ سے کہا "جلد تیار ہو جائیے تین بجے ایک جلوس کی شکل میں ہم لوگ اجتماع گاہ چلیں گے۔ ہمارے ساتھ تقریباً تین سو بہنیں ہوں گی۔ آپ کو صدر صاحبہ کے ساتھ رہنا ہوگا۔ اور یہی فقرہ جو آپ نے لکھا ہے ایک اپنے بائیں بازو پر باندھ لیجئے۔ دیکھئے اس طرح!"

یہ کہہ کر اس نے ایک کارڈ لیا۔ اسے اپنے بازو پر لپیٹا اور تاگے سے باندھ لیا۔ میں اس تیاری ہی میں تھی کہ عورتیں آنا شروع ہو گئیں۔ ڈھائی بجے تک سب جمع ہو گئیں۔ مسز ہیلن جنرل سکریٹری انجمن خواتین عورستان نے جلوس ترتیب دیا۔ مجھے صدر صاحبہ کی بغل میں کھڑا کر دیا گیا۔ یہ بات میں پھر عرض کر دوں کہ میرے سوا کوئی عورت اس جلوس میں نوجوان تو کیا جوان بھی نہ تھی۔ سب کی سب ادھیڑ سے اوپر تھیں۔

ٹھیک تین بجے "نئی تہذیب مردہ باد" کا ایک نعرہ لگایا گیا۔ پھر یہی نعرہ لگاتے ہوئے شہر کی طرف چلیں شہر دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا جزیرۂ عورستان کا یہ مرکزی مقام "مدرلینڈ" اچھا خاصہ شہر تھا۔ مدرلینڈ کی تہذیب سمجھنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کیوں کہ وہ ہمارے یوروپین شہروں کی بالکل نقل تھا۔ جب یہ جلوس شہر میں پہونچا تو شہر کی بھی بہت سی عورتیں آ آکر ہمارے ساتھ ہو گئیں۔ سب مجھے حیرت اور مسرّت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتیں۔ (میں اس وقت اس کی وجہ نہ سمجھ سکی تھی) یہ جلوس مین روڈ ہوتا ہوا بازاروں، دفاتر، اسکولس کالجز کی طرف چکر لگاتا، ویلسن پارک کی طرف چلا۔ راستے میں مردوں، نوجوانوں، چھوکریوں، اسکولس اور کالجز کے طلباء اور طالبات نے ہمارا خوب خوب مذاق اڑایا۔ یہ جملہ خاص طور سے سُنا گیا کہ "نو سو چوہے کھا کر بلّیاں حج کو چلیں۔"

اجتماع گاہ میں پندرہ کارکن بہنیں موجود تھیں۔ ان کے علاوہ دیہات کی بہت سی کمزور اور بوڑھی عورتیں بھی جمع تھیں۔ ان کے ساتھ کچھ نوجوان اور کم عمر لڑکیاں اور بہت سے

بہت سے بوڑھے مرد بھی تھے۔ سی۔آئی۔ڈی اور پولیس کے کرم فرما بھی موجود تھے۔ نیز اخبارات کے نامہ نگار بھی اپنا فرض ادا کرنے آتے ہوئے تھے۔

یہاں تمام شرکائے اجتماع سلیقے کے ساتھ ایک خاص ترتیب سے بیٹھ گئے۔ صدر صاحبہ اپنی افتتاحیہ تقریر کرنے بیٹھ گئیں۔ اس کے بعد جنرل سکریٹری نے پچھلی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ پھر مشہور خطیب مسز پاول پرائس کا مختصر تعارف کرایا۔ مسز پاول پرائس کی خطابت کی تعریف میں نے اپنے وطن کے اخبارات میں پڑھی تھی۔ اور میں ان سے ایک گونہ متاثر بھی تھی۔ انہی کی تقریر دراصل اس اجتماع کی جان تھی۔ جسے تمام نامہ نگاروں اور سی۔آئی۔ڈی کے لوگوں نے قلم بند کیا۔ اور اس تقریر کا نفسِ مطلب میرے ذہن میں بھی محفوظ رہ گیا۔ انہوں نے فرمایا:۔

"شریف خواتین اور معصوم بچو! سب سے پہلے میں آپ کو ایک یورپین لیڈی سے متعارف کراؤں گی۔" مسز پاول پرائس کے اس جملے پر میں چونکی۔ "یورپین لیڈی سے مراد یقیناً میں ہوں"۔ میرا خیال ٹھیک تھا۔ تمام مجمع مجھے دیکھنے لگا تھا۔ مسز پاول پرائس نے فرمایا:۔

"مسز مائیکل ایک حادثہ سے دوچار ہو کر ہمارے یہاں اچانک آئی ہوئی ہیں۔ انہوں نے ہم سے جزیرۂ عورستان کی معاشرت اور اس کے تمدن کے بارے میں دریافت فرمایا ہے۔ میں اس وقت اسی موضوع پر کچھ عرض کروں گی۔ روح القدس نے چاہا تو میں جزیرۂ عورستان کی من و عن معاشرت تو نہیں ہاں ماضی قریب کی تباہ کاریوں کی ایک داستان اس طرح بیان کروں گی کہ مستقبل کی ہولناکیاں بھی سامنے آ جائیں گی اور ہمارے موجودہ تمدن کا نقشہ بھی کچھ نہ کچھ کھنچ جائے گا۔ اس کے بعد مسز مائیکل میری تقریر پر تبصرہ فرمائیں گی۔

"یعنی میں ــ!" میں چونک سی پڑی۔ میں تو تیار بھی نہیں پھر مجھے کیا معلوم کہ فاضل مقرر کیا فرمائیں گی، لگاتار کئی جملے میری زبان سے نکل گئے۔ اور میں نیم استادہ ہو کر پھر بیٹھ گئی۔ مسز پاول پرائس نے میری طرف دیکھا۔ لیکن اُن کی تقریر کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ پورے جوش کے ساتھ کہہ رہی تھیں:۔

"ہوائیں گواہ ہیں کہ اب سے تیس برس پہلے جنگِ عظیم میں جزیرۂ عورستان میں کیا کچھ گزر گیا۔ فضائیں شہادت دے رہی ہیں کہ کن حالات سے دوچار ہو چکے ہیں جزیرۂ عورستان کا ذرہ ذرہ زبانِ حال سے پکار رہا ہے کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔

"ہیر ہیر" اس اندازِ تخاطب پر میں نے دل ہی دل میں داد دی۔ مسز پاول پرائس کی تقریر میں انتہائی جوش تھا۔ تمام مجمع خاموشی کے ساتھ ان کی طرف متوجہ تھا۔ اور وہ خود، مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کانپ رہی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں:۔

"معصوم بیٹیو! آپ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ آپ کی یہ مائیں جن کا دودھ خون بن کر آپ کی رگوں میں دوڑ رہا ہے، اس دور سے گزری ہیں۔ اگر گوشِ نصیحت نیوش اور دیدۂ عبرت نگاہ ہو تو میری سینے اور اپنی ماؤں کو دیکھئے۔ جزیرۂ عورستان کو جنگِ عظیم میں مجبوراً شریک ہونا پڑا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ یہاں کی آبادی کتنی ہے؟ اس وقت تو اتنی بھی نہ تھی کہ اس کی حفاظت ہی کے لیے پولیس اور فوج کے سپاہی حسب ضرورت مل سکتے۔ کجا یہ کہ بڑھ کر جارحانہ اقدام کیا جاتا۔ مجبوراً تمام مردوں کو جبراً بھرتی کرنے کی تجویز ہوئی مگر سوال یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ پھر عورستان کا وہ کاروبار، جو مردوں سے متعلق ہے کون سنبھالے گا؟"

"اے میری نادان اور بھولی بچیو! آج جو آپ تیتری کی طرح آزاد، ہر جگہ گھوم پھر رہی ہیں۔ اُس وقت ہمارا یہ حال نہ تھا۔ ہم عورتوں اور مردوں نے باہم کام تقسیم کر لیا تھا۔ مرد باہر کام کرتے تھے۔ اور ہم گھر کی رانی بن کر رہ رہی تھیں۔ میری اس بات پر ہماری کچھ بچیاں مسکرا رہی ہیں۔ انھیں کیا معلوم؟ کہ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا، جب یہ ہماری عمر کو پہنچیں گی تب معلوم ہو گا، مگر افسوس کہ وقت گزر چکا ہو گا۔

ہاں، تو میں اس تجویز کا ذکر کر رہی تھی کہ جب تمام مرد محاذِ جنگ پر چلے جائیں گے تو ان کا قائم مقام کون ہو گا؟ ہم سب اس وقت نوجوان تھیں بالکل ایسی ہی جیسی ہماری مہمان عزیز مسٹر مائیکل ہیں۔ ہم نازک تھیں۔ پھول کی طرح ہم پاک تھیں معصوم مریم کی طرح

(ہیر ہیر تالیاں) مسز پاول پرائس نے ہاتھ اٹھا کر خاموش کیا اور پھر گویا ہوئیں۔

"جنگ کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے۔ اخبارات نے حُب وطن کے نشے سے باشندگان عورستان کو متوالا بنا دیا تھا۔ ہر شخص جان پر کھیل جانے کو تُل گیا۔ ہم عورتوں کو اُبھارا گیا کہ آگے بڑھو۔ باہر کا کاروبار سنبھالو میں قدرت نے عظیم قوت بھر دی ہے۔ مگر تم اس سے آشنا نہیں ہو۔ ظاہر میں تو تم عورت ہو۔ پھول کی طرح نرم و نازک لیکن سخت ہو جاؤ تو پتھر تمہارے آگے ہیچ ہے۔

اس طرح ہمارے ذہن کو بدلنے کی کوشش شروع ہوئی۔ مگر عورتوں کی طرف سے کوئی خاص پذیرائی نہیں ہوئی۔ اس وقت شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے بیشتر مرد بھی دل سے اس تجویز پر عامل نہ ہو سکے۔ بہت تھوڑی عورتیں جو بیوہ اور بے روزگار تھیں، حکومت کے ہاتھ آئیں جنھیں معمولی ٹریننگ دے کر مناسب جگہوں پر مقرر کر دیا گیا۔ ان کی خاطر مدارات کا خوب بندوبست کیا گیا۔ انھیں بھاری تنخواہیں دی گئیں اور انھیں یہ کام بھی سپرد کیا گیا کہ صنفِ نازک کو گھر سے نکالیں۔ وہ فوق البھڑک اور زرق برق لباس میں ہمارے پاس آتیں، ہم سے بے تکلف ملتیں، گھر سے باہر کی فضا کی دلچسپیوں کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچتیں جنگ کی بات برائے نام کرتیں کھلی جگہ کی صاف اور ستھری ہوا، بازاروں کی فضا، پارکوں کی چہل پہل، جوان مردوں کی ملاقاتوں کے آزادانہ چہچہے۔ آرام و آسائش، عیش و مسرت۔ غرضیکہ ہر چیز کا بیان زبان کی پوری قوت سے کرتیں۔ ادھر اخبارات ہمارے لیٹرن سے لے کر ڈرائنگ روم تک کی ہوا کو گھٹی گھٹی ثابت کر کے تندرستی کے لیے مضر بتاتے۔ چونکہ اس جنگ میں فریق مخالف کا حامی ایک زبردست مسلم ملک تھا۔ اس لیے اسلامی پردے پر بری طرح لے دے ہوتی۔ برقعوں میں لپٹی ہوئی عورتوں کے کارٹون شائع ہوتے۔ پردہ دار خاتونوں کے چہرے مدقوق ظاہر کیے جاتے۔ مسلمان مردوں کو ظالم قرار دیا جاتا اور ثابت کیا جاتا کہ اسلام نے عورتوں کو گھر کے اندر دھکیل کر لونڈی بنا دیا ہے۔ پردہ فطرت کے خلاف اور بیماری کا ضامن ہے وغیرہ وغیرہ۔

کھلے میدانوں میں کھیل کے فوائد ہیں بتائے جاتے۔ ہم کو ایسے سینما دکھائے جاتے جنمیں نوجوان لڑکیاں ٹینس، فٹ بال، والی بال، ہاکی، باسکٹ بال گھوڑ دوڑ اور ایسے ہی تمام ورزشی کھیل کھیلتی ہوتیں سینما میں کام کرنے والی ان چھوکریوں کی بے محابا اداؤں نے ہمیں لبھانے کی انتھک کوشش کی۔ دھیرے دھیرے ہمارے دل میں بھی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہے کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے اور زندہ دلی کے معنی یہ ہیں جو ان باہر والیوں کو حاصل ہے۔

غرضیکہ ہم گھر سے نکلیں۔ جو مرد محاذ جنگ کی طرف گیا اُس کی جگہ ہم نے سنبھال لی۔ اسکول اور کالج تو بند ہی کر دیئے گئے۔ ان میں مختلف قسم کے دفاتر قائم ہوئے۔ پڑھی لکھی عورت چاہے وہ جوان ہو چاہے بوڑھی جیسی بھی مل سکی، کام پر لگائی گئی۔ غیر تعلیم یافتہ کو پولیس کی خدمات سپرد ہوئیں۔ جسطرح بنا ہم نے سارے محکموں کو سنبھالا۔ جنگ میں ہماری فتح ہوئی۔ اور پھر ہماری خدمات کو حکومت نے خوب سراہا۔ بھرے مجمعوں میں ہمیں تمغے دیتے گیے۔ پرزور لفظوں میں ہماری تعریف کی گئی۔ اور ہم سے درخواست کی گئی کہ بدستور اپنی جگہوں پر قائم رہیں۔ کیوں کہ جنگ میں ہمارے بہت سے مرد کام آچکے تھے۔ اور اُن کی جگہ پر کرنے کے لیے ہمارے پاس مرد نہیں تھے۔

بیٹیو، سُنو! ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا کام ختم ہوگیا۔ لیکن نہیں۔ ابھی ہم سے اور کام لینا تھا۔ اب ہمیں یہ پٹی پڑھائی گئی کہ ملک کی مردم شماری بڑھانے کے لیے وطن کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اولاد پیدا کی جائے۔ ہم میں سن رسیدہ عورتوں نے اسے گھناؤنی تجویز کہا۔ لیکن حکومت کو ایسی جوان عورتیں مل ہی گئیں جن کے شوہر جنگ میں مارے جا چکے تھے اور جن کے سامنے معاشرتی تسکین کے لیے اس سے بہتر کوئی اسکیم ہی نہ تھی۔ ان مزدورنیوں کو دنیا جہاں کی مراعات کے ساتھ، ہزاروں ہزار شکریہ کے ساتھ تندرست، خوبصورت اور من چلے مردوں کے درمیان زیادہ تر فوجیوں کے بیچ چھوڑ دیا گیا۔ اب رقص و سرود کی محفلیں جمیں عشقیہ افسانے سینما کے سانچے میں ڈھلے۔ گراموفون کے ریکاڈوں میں آہا باہر کی ہوا، ارے آزاد فضا" جیسے گانے

ریکارڈ ہوئے۔ اشعار اور افسانوں میں اب ان نگاہوں کی تعریف نہیں ہوتی تھی جو کسی مرد کی نگاہ سے دوچار ہوکر جھک جائیں۔ وہ تمام اشعار بے معنی قرار دیئے گئے جو اس طرح کے تھے

جھکی جارہی ہیں وہ معصوم نظریں دیا جارہا ہے جوابِ محبت!

بلکہ اب یہ کہا گیا۔ "کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو"

آہ، سوچا تھا کہ جنگ کے بعد ہم پھر گھر کی ملکہ بنیں گی۔ مگر وائے خود غرض مرد! اس نے جو دیکھا کہ عورت روپیہ بھی کما سکتی ہے اور دل بھی بہلا سکتی ہے، تو اس نے سوچا کہ اب یہ شکار گرفت کے باہر نہ جانے پائے۔ مرد نے اب ایسا حسین وار کیا کہ عورت کچھ نہ سمجھی اور زندگی کے میدان میں مرد سے بڑی خوبصورت مات کھا گئی۔ ہر محکمہ میں عورت اور مرد کا مقابلہ ہوا۔ مرد نے ہر جگہ قصداً شکست کھائی۔ عورت کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ اس کے ماتھے پر غرور کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ فریب خوردہ نے کچھ نہ سمجھ کر سمجھا کہ اس کے اندر مرد سے زیادہ صلاحیت ہے اب وہ خود آگے بڑھی اپنے نسوانی لباس کو اتار کر پھینکا۔ وزارت سے لے کر معلمی تک ہر کوچہ کی سیر اُس نے کی۔ اور ہر جگہ خاص پزیرائی ہوئی۔ اس کی خامیوں کو نظر انداز کیا گیا۔ ہر مہینے اُسے ایک ہفتہ کی باتنخواہ چھٹی دی گئی۔ "ضرورت" پڑنے پر ہر سال تین مہینے کی رعایتی رخصت اُس کے لیے مخصوص کی گئی۔ عورت کے لیے اگر ایک طرف ہر محکمہ کا دروازہ کھلا تھا تو دوسری طرف مخلوط تعلیم کا انتظام شروع ہوا۔ تاکہ جو فطری حیا رہ گئی ہے وہ بچپن ہی سے پس کر رہ جاتے۔ ان طلبا اور طالبات کے لیے نئے قسم کے پارک بنے۔ ان پارکوں میں خوبصورت جھاڑیاں بنائی گئیں لڑکے اور لڑکیاں اس میں دندناتی پھرتیں۔ ایک ساتھ فوٹو کھنچواتیں۔ اب ذہن بدلا تو ساری زندگی ہی بدل گئی۔ کسی "بوڑھی کھوسٹ" نے مستقبل پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی تو اسے ٹھکرا دیا گیا۔ ہوش کب آیا۔ جب ہوش آنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مرد نے اُس کے جسم کو پوری طرح شکنجے میں جکڑ دیا تھا۔ ماضی اور حال کا مقابلہ کیا تو ہم نے اپنے کو سراسر گھاٹے میں پایا۔ ہماری پچھلی زندگی میں مرد کماتا تھا اور اس کی کمائی عورت کے کام آتی تھی۔ آج عورت کماتی

ہے اور اس کی کمائی مرد کے کام آتی ہے پچھلی زندگی میں عورت گھر کی رانی تھی اور شوہر کے سوا کوئی اور اس کی دل چسپیوں کا مرکز نہ تھا۔ آج عورت دفتروں اور پارکوں کی زینت بنی ہوئی ہے۔ اور وہ اب ایسا پھول ہے جو ہر بھونرے کی آماجگاہ بنا ہے پچھلی زندگی میں ایک مرد کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے عورت بیماریوں سے محفوظ تھی۔ اب ہر مرد کے اختلاط نے عورت کے اندر خوفناک امراض پیدا کر دیتے ہیں۔ پچھلی زندگی میں عورت معصوم مریم کی طرح بھولی تھی۔ صداقت، ہمدردی اور محبت کا مجسمہ تھی اب طوائف سے زیادہ بے حیا ہے۔ عیاری جھوٹ، دغا اور رشک وحسد کا نمونہ ہے۔

بہنو اور بیٹیو! یہ ہے وہ نقشہ جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا میں جو کچھ دیکھتی ہوں، وہ تم نہیں دیکھتیں۔ جو میں جانتی ہوں تم نہیں جانتیں میرا کہنا مانو گی تو اپنا بھلا کرو گی۔ ورنہ جب یہ چکنی اور ریشمیں کھال اُتر جائے گی اُس وقت جاننے ماننے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مسز مائیکل اپنی بدقسمتی سے اور (مسز پاول پرائس نے مسکرا کر کہا) ہماری خوش قسمتی سے ہمارے درمیان ہیں۔ اب وہ میری تقریر پر تبصرہ فرمائیں گی خدا حافظ۔"

مسز پاؤل پرائس کی تقریر ختم ہوگئی۔ میرے لیے جوابی تقریر کرنا ناگزیر ہوگیا انھوں نے اپنی تقریر میں کئی بار اس تقاضے کا اظہار کیا تھا میں بھی اپنی تقریر اس عرصہ میں تیار کر چکی تھی۔ میں نے پہلے اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر مختصر تمہید کے بعد کہا:۔

"جس پچھلے زمانے کا ذکر فاضل خطیب نے کیا ہے اُس وقت مرد کی مثال اُس گھوڑے جیسی تھی جو دن بھر تانگے میں جُتا رہتا ہے۔ اور دن بھر دوڑ دھوپ کر کے تانگے والے کو دس پانچ روپیہ دے دیتا ہے۔ تانگے والا شام کو گھوڑے کے سامنے دانہ اور گھاس ڈال دیتا ہے اور پھر اس غرض کے لیے اُس کے ہاتھ پاؤں ملتا ہے تاکہ کل پھر تازہ دم ہوکر آمدنی کا ذریعہ بنے۔ آج اُس گھوڑے کی جگہ عورت نے لے لی اور تانگے پر قبضہ مرد کا ہوگیا۔ لطف یہ ہے کہ مرد دوسرے دن کی آمدنی کے لیے تازہ دم کرنے کی خاطر اس گھوڑے کے آگے دانہ اور گھاس ڈالنے اور

اس کے ہاتھ پیر ملنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ یہ کام بھی اسی کے سر منڈھ دیا کہ جہاں سے چاہے دانہ کھالے، گھاس چرلے۔ اور جس سے چاہے مالش کرالے پھر طرّہ یہ کہ خود تانگے سے نہیں اُترتا۔ اسے ڈر ہے کہ کہیں عورت کو ہوش آجائے۔ اور وہ پھر مرد کو گھوڑا بنا کر تانگے میں جوت دے۔"

اس مختصر اور مثالی تقریر کے بعد میں بیٹھ گئی۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ صدر صاحبہ "ہیر ہیر" کہتی میری طرف بڑھیں۔ مجھے گلے لگایا۔ اور خوشی کے مارے اس زور سے مجھے بھینچا کہ میں تھک گئی۔ میری آنکھیں مُند گئیں۔ انہوں نے کہا "ارے آنکھیں تو کھولوں!" میں نے آنکھیں کھول دیں۔ "ارے! ایں!! ۔ ڈارلنگ تم!!!"

مسٹر مائیکل نے مجھے اُٹھایا۔ بولے "افوہ! تم کتنا سوتیں! خوش خبری ہو اب ہمارے جہاز کا رُخ ٹھیک اپنے مرکز کی طرف ہے۔"

دو کِردار

(۱)

ووٹر لسٹ میں اپنا نام دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ سوچنے لگا کہ اب میرے یہاں بھی بڑے بڑے لوگ آیا کریں گے۔ سوسائٹی میں اب میرا بھی ایک مقام ہو گا۔ سِمینٹ آسانی سے مل سکے گا۔ دروازے پر چبوترے کی تمنّا بھی پوری ہو جائے گی۔

میں انھی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی دستک سُن کر میرے طلسمِ خیال کا تار و پود بکھر گیا۔ اُٹھا۔ باہر کو چلا۔ گھر سے نکلا تو ہکّا بکّا رہ گیا۔ وہ تو کہیئے مختار صاحب نے بھانپ لیا مُسکرا کر فرمایا۔" ارے بھئی اچھے ہو سعید؟" میں نے نوازش، کرم کہتے ہوتے سر جھکا دیا۔

" بڑا سعید لڑکا ہے۔" مختار صاحب نے پھر کہا۔" اسم بامسمّٰی" ایک دوسرے صاحب کی زبان سے برجستہ نکلا۔

ان بزرگوں کی یہ شفقت دیکھی تو مجھے سخت ندامت ہوئی کہ اتنی دیر سے کھڑے ہیں سب، اور مجھے یہ بھی توفیق نہ ہوئی کہ بیٹھنے کو کہتا۔ میں نے بڑی سعادت مندی کے ساتھ کہا:۔

تشریف رکھیں حضور! چارپائی لاؤں۔۔۔۔"

"نہیں نہیں بھئی! کانگریس دفتر جارہا تھا، راستے میں تمہارا گھر پڑا تو شیخ صاحب یاد آگئے، سوچا ان کی نشانی دیکھ لوں۔ بس میاں! تمہیں دیکھ لیا دل شاد ہوگیا" اور یہ کہہ کر مختار صاحب میری پیٹھ تھپکنے لگے۔ میں نے عرض کیا "تو حضور پان ہی سے شغل۔۔۔۔"

"ارے میاں چھوڑو پان، کہو تمہاری والدہ محترمہ اچھی ہیں؟"

"جی ہاں دعا کرتی ہیں"

اور تم کیا کرتے ہو؟"

"ٹیوشن کرتا ہوں قبلہ!"

"خوب! اچھا خدا حافظ۔ اپنی والدہ کو ہمارا سلام کہہ دینا اور بیٹے کبھی کبھی ہمارے یہاں بھی آیا کرو۔ اپنا ہی گھر سمجھو۔ نواب دولہ اب ماشاء اللہ پانچ چھ برس کا ہوگیا اُسے کچھ شُد بُد بتا دیا کرو۔ اور لو یہ دو ماہ کی پیشگی ٹیوشن فیس۔" چالیس روپے اپنے ہاتھ میں دیکھ کر حیران رہ گیا میں نے مختار صاحب کی مہربانی دیکھ کر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ مختار صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ ایک طرف چل دیئے۔

۲

جیسے جیسے الیکشن کا زمانہ قریب آتا گیا الیکشن کی ہماہمی بڑھتی گئی۔ برساتی کیڑوں کی طرح امیدوار اپنے ہمدردوں کے ساتھ گلی گلی پھرنے لگے۔ ہر پارٹی اپنے منہ میاں مٹھو بنتی اور دوسروں پر وہ کیچڑ اُچھالتی کہ توبہ بھلی۔ امیدوار ووٹوں کے حاصل کرنے اور ممبری کے لالچ میں پاگلوں کی طرح در در مارے مارے پھرنے لگے۔ یہی حالت مختار صاحب کے بھائی شوکت صاحب کی تھی، وہ کانگریس کی طرف سے امیدوار تھے۔ ایک دن وہ مجید صاحب کے ساتھ غریب خانہ پر آدھمکے میں گھبرا کر نکلا، چارپائی لایا، گلی میں ڈال دی۔ سلام اور مزاج پرسی کے بعد بولے:۔

"کہو بھئی! ہم نے سنا ہے تم ووٹ کا مرید فرید کو دو گے؟"

"جی ہاں، طے تو یہی کیا ہے۔"

"کیوں؟"

"بعض رشتے داروں کی خاطر اُن سے وعدہ کر لیا ہے۔"

"اجی الیکشن میں وعدہ وعید الگ رہتا ہے۔"

میں نے دل میں سوچا یہ الیکشن بھی کیا بلا ہے۔ گڑے ہوئے مُردے اس میں اکھیڑے جاتے ہیں صریحاً جھوٹ اس میں بولا جاتا ہے۔ مقابل کی بدگوئی پوری قوت سے کی جاتی ہے اپنے منھ سے اپنی تعریف کرتے ہوئے کوئی امیدوار نہیں جھجکتا۔ سارے جہاں کا درد اپنے ہی جگر میں لیے پھرتا ہے۔ وعدوں کا بھی پاس نہیں۔ میں نے دل میں کہا جب الیکشن کے وعدوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں تو جو ووٹ مانگے اس سے وعدہ کر لو۔ یہ سوچ کر میں دل ہی دل میں مسکرایا اور شوکت صاحب سے کہا:

"اچھی بات ہے، میں ووٹ آپ ہی کو دوں گا۔"

شوکت صاحب دعا دے کر چلے گئے۔

۳

"ذرا دیکھنا سعید! یہ سامنے والا نشان کس پارٹی کا ہے؟" ضمیر نے ہاتھیوں والے نشان کی طرف متوجہ کر کے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے جواب دیا۔

"کسی پارٹی کا ہو مگر مجھے اس نشان سے سخت نفرت ہے!!"

"کیوں؟" ضمیر نے دریافت کیا۔

"اس ہاتھیوں والے نشان سے مجھے اصحابِ فیل کی یاد آتی ہے۔"

"ماشاء اللہ! تمہارے اندر دین کا جذبہ کافی معلوم ہوتا ہے۔"

"کافی؟ کافی آپ نے خوب فرمایا۔ الحمد للہ کہ میں مسلمان ہوں۔"

"تو مسلمان ہی کی حیثیت سے اس مسئلے پر غور کیوں نہیں کرتے؟"

"کس مسئلے پر؟"

یعنی اس الیکشن پر!"

"کیا مطلب آپ کا؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آج کل جس طرح الیکشن ہو رہے ہیں ان میں حصّہ لینا ایک بھلے مانس کے لیے ٹھیک بھی ہے؟"

"ضمیر صاحب ذرا وضاحت فرمائیے!"

"میرا مطلب یہ ہے کہ یہ جو ہر امیدوار اپنے منہ میاں مٹھو بن رہا ہے، اسٹیج پر پہنچ کر صریحاً جھوٹ بول رہا ہے۔ اپنے مقابل امیدواروں کے گڑے مُردے اُکھیڑ رہا ہے، پیسوں سے ووٹ خرید رہا ہے۔ دھن، دھونس، دھوکا اور دھاندلی سے کام لے رہا ہے، میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں ایک بھلے مانس خصوصاً تمہارے جیسے مسلمان کے لیے کسی کا ساتھ دینا جائز بھی ہے؟"

یہی خیال کئی دن پہلے مجھے بھی آیا تھا مگر اس وقت ضمیر نے جو کہا تو اب میں چپ، جواب ہی کیا تھا۔ جب ضمیر نے دوبارہ جواز کی صورت پوچھی تو میں نے کہا:۔

"اور جو یہ علماء بڑھ بڑھ کر حصّے لے رہے ہیں؟"

دیکھو سعید! (ضمیر نے سمجھایا) اپنی اپنی گور میں سب کو سونا ہے، قیامت میں علماء کے بارے میں تم سے سوال نہ ہوگا۔ وہاں تم سے تمہارے اپنے بارے میں پوچھا جائے گا۔ یہ سوچ لو"

میری زبان بند ہونے کو تھی کہ ایک بات اور سمجھ میں آگئی۔ میں نے کہا:۔

"لیکن اگر کوئی مسلمان الیکشن میں حصّہ نہ لے تو ساری سیٹیں غیر مسلموں کے قبضے میں آئیں گی خصوصاً متعصب ہندوؤں کی بن آئے گی، وہ تو ممبر ہوتے ہی مسلمانوں کی زندگی دوبھر کر دیں گے۔"

"تمہارا یہ اعتراض سیاست سے عدمِ واقفیت کا کھلا ثبوت ہے"۔

"کیسے ؟"

"اِس طرح کہ پاکستان بننے کے بعد ایک ہندو اب کچھ اس طرح سوچتا ہے کہ مسلمان اب بھی حکومت میں برابر کے حصّے دار بنے ہوئے ہیں تو اس کے کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور چونکہ بھارت کی سب سے بڑی اقلیت مسلمان ہیں اس لیے انھیں اپنی راہ کا روڑا سمجھتا ہے۔ وہ وزارت میں بھی مسلمانوں کو دیکھتا ہے، عہدوں پر بھی دیکھتا ہے اور ہر محکمے میں بھی، تو اس کا غصہ بڑھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا دماغی توازن جواب دے جاتا ہے اور جس طرح بھی ہوتا ہے جانی اور مالی نقصان کرا دیتا ہے۔ روز روز کے یہ ہندو مسلم فساد آخر کس خلش کا نتیجہ ہیں۔ اے کاش! کہ یہ راز مسلمانوں کی سمجھ میں آجاتا اور وہ الیکشن سے ہاتھ اُٹھا لیتے تو ایسے تمام ہندو ان سے مطمئن ہو جاتے"۔

"اور پھر مسلمان بھارت میں بھاڑ جھونکیں؟"

میرے اس "بھاڑ جھونکنے" پر ضمیر مسکرایا، بولا:۔

"بھاڑ کیوں جھونکیں، بیسیوں کام ایسے ہیں جو مسلمانوں کے کرنے کے ہیں پھر ان کاموں کی اصلاح کے بغیر مسلمان کہیں بھی اپنا مقام نہ بنا سکے گا۔ تم کہو گے وہ کون سے کام ہیں؟ میں عرض کروں گا کہ مسلمانوں کا تعلیمی مسئلہ ہی بے حد توجہ طلب ہے معاشی مسئلہ کیا کم روح فرسا ہے، پھر معاشرتی خرابیوں نے تو مسلمانوں کی کمر ہی توڑ دی ہے۔ کس کس کو رویا جائے، کوئی چول درست نہیں، آوے کا آوا بگڑا ہے اور تم ہو کہ ان باتوں کی اصلاح کے بغیر سیاست میں ان کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو جو تعداد میں تم سے زیادہ، مالی اعتبار سے تم سے بہتر، تعلیم میں تم سے آگے، تجارت میں تم زمین وہ آسمان۔ پھر قومی حیثیت سے ان میں ایک لگن ہے، ایثار و قربانی کا جذبہ ہے، اور تم ان ساری خوبیوں سے کورے ہو۔

ضمیر کے اس تبصرے پر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی، میرا گھر بھی قریب آگیا تھا۔

میں اپنے گھر میں داخل ہوا اور سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

(۴)

میں نے کسی سے کہا تو نہیں مگر اب میں ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ کبھی سوچتا یہ سب خود غرض ہیں، کامیاب ہو کر بات بھی نہ کریں گے کسی کو ووٹ مت دو۔ کبھی سوچتا کہ ووٹ قومی امانت ہے اسے ضائع نہ کرنا چاہیے۔ پھر رات دن لوگوں میں رہنا ہے۔ اگر کسی کو ووٹ نہیں دیا تو یوسفِ بے کارواں ہو کر رہ جاؤ گے۔ اور ظاہر ہے سب سے الگ دنیا بنانا کم سے کم میرے بس کا کام نہیں۔ برادری کا زور بھی پڑ رہا تھا۔ کچھ کانگریس کے طرفدار، کچھ مزدوروں کے، بعض سوشلسٹ اور بعض آزاد خیال۔ اور پھر مختار صاحب شوکت صاحب کے بھائی جن کے یہاں بیس روپے ماہوار کا ٹیوشن ہے۔"

اسے حسنِ اتفاق کہئے یا سوءِ اتفاق، انہی دنوں میں مولانا کمال صاحب کو جن سنگھ کے اسٹیج پر تقریر کرتے دیکھا۔ صرف میں نے ہی نہیں تمام لوگوں نے۔ مولانا نے اپنی تقریر میں ایک عجیب بات کہی۔ آپ نے فرمایا کہ "آج کوئی جماعت یہ دعویٰ نہیں کرسکتی ہے کہ وہ مذہبی جماعت ہے۔ صرف جن سنگھ ہی وہ مذہبی جماعت ہے جو توحید کے تقاضوں کے ساتھ نہ سہی خدا کو تو مانتی ہے، اور نہ اسلامی سہی، ہندو دھرم کے مذہبی اصولوں پر بھارت کے نظام کو چلانے کا عزم تو کرتی ہے۔ لہٰذا ان تمام لوگوں سے میری اپیل ہے جو خدا کو مانتے ہیں جن سنگھ کا ساتھ دیں۔"

مولانا کی تقریر سن کر میں حیران رہ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا کمال صاحب کو جن سنگھ کی طرف سے پانچ ہزار ملے ہیں، وہ جن سنگھ کی سی نہ کہیں گے تو کس کی کہیں گے۔ مثل مشہور ہے کہ جس کا کھایا اس کا گایا۔

یہ معلوم ہونے پر میری سمجھ میں آگیا کہ یہ سب جو کچھ ہو رہا ہے روپے کے لیے ہو رہا ہے، لہٰذا میں نے پہلے جھجکتے ہوئے پھر صاف صاف کہہ دیا کہ جو زیادہ پیسے دے گا وہ میرا ووٹ حاصل کرے گا۔ میرا خیال تھا کہ شوکت صاحب زیادہ پیسے دینے میں کامیاب ہوں گے مگر

میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ غریب مزدوروں کے نمائندے کامریڈ فرید صاحب کی بولی زیادہ رہی اور انھوں نے پانچ سو پر میرا ووٹ اس قید کے ساتھ خرید لیا کہ میں اپنے ملنے والوں کو بتا دوں کامریڈ فرید صاحب کو ووٹ دوں گا۔

مختار صاحب کو اس سودے کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے بھتیجے کے ٹیوشن سے مجھے سبکدوش کرا دیا۔

(۵)

دوسرے دن ووٹ پڑنے والے تھے رات ہی کو میں نے اپنے ملنے والوں سے کہہ دیا کہ میں تو کامریڈ صاحب ہی کو ووٹ دوں گا میرے اس کہنے سے بہت سے وہ لوگ جو میرے میل کے تھے اور ووٹ دینے میں یکسو نہ ہوئے تھے یکایک مزدور پارٹی کے حق میں ہو گئے اور اس وقت کامریڈ فرید صاحب کی چالاکی میری سمجھ میں آئی یعنی یہ کہ میرا ووٹ پانچ سو کا خرید کر انھیں سودا گراں نہیں پڑا۔

ووٹنگ کے دن سڑکوں پر، شہر بھر میں، گلی گلی، محلے محلے اور جگہ جگہ ایک قیامت برپا تھی۔ یکے، تانگے اور موٹریں دوڑ رہی تھیں۔ تمام امیدواروں نے حسبِ کوشش اور بقدرِ ضرورت سواریاں ریزرو کر رکھی تھیں اور ووٹروں کو ان میں بھُس کی طرح بھر بھر کر پولنگ اسٹیشن لے جا رہے تھے۔ ہر طرف "جلدی کرو" کا شورِ بے ہنگام تھا۔ پولنگ اسٹیشن سے دو دو فرلانگ کے فاصلے پر موزوں و مناسب مقامات پر بساطِ ممبری کے تمام "جواری" اپنا اپنا پھڑ جمائے تھے۔ خاطر و مدارات کے تمام لوازمات وہاں موجود تھے، جسے آتے دیکھتے دانت نکال کر اس کی طرف دوڑتے۔ امید و بیم کی ایسی ملی جلی کیفیت ان پر طاری تھی جو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مزدور پارٹی کے کارکن کئی بار میرے گھر پر بھی آ چکے تھے۔ میں گیارہ بجے پولنگ اسٹیشن کی طرف چل دیا راستے میں کامریڈ فرید صاحب ایک کار میں ووٹروں کو بھرے بھاگے چلے جا رہے تھے، مجھے پیدل دیکھا تو فوراً کار روکی، مجھ سے کہا آئیے۔ میں نے اطمینان دلایا، چلیے آ ہی رہا ہوں

انھیں اطمینان تو تھا ہی، آگے بڑھ گئے۔ ابھی میں راستے ہی میں تھا کہ کامریڈ صاحب اسی کار میں ان ووٹروں کو بھرے ہوئے واپس ہوئے جو ووٹ ڈال چکے تھے۔ یہ لوگ اس طرح کار میں بھرے تھے کہ بہت سے تو اندر سامان کی طرح تلے اوپر بہت سے اِدھر اُدھر پائدان پر۔ بوکھلاہٹ، بدحواسی اور جلدی تو تھی ہی خدا جانے ایک شخص سے کیا غفلت ہوئی کہ وہ کار سے گرا، دوسرے لوگوں نے شور مچایا، کامریڈ فرید صاحب نے پوچھا" کیا یہ شخص ووٹ دے چکا ہے" جواب ملا " ہاں " فرمایا گر جانے دو، اب اس کے لیے وقت خراب نہیں کیا جاسکتا۔"

یہ ساری واردات چند سکنڈ میں ہو گئی۔ کامریڈ فرید صاحب فر فر کار پر اڑ گئے۔ گرا ہوا غریب ایک ملبا سے ٹکرایا اور بے ہوش ہو گیا۔ یہاں کسے ہوش تھا جو اس کی مدد کرتا۔ یکایک میں نے دیکھا کہ میرا ناصح اور دوست ضمیر ایک طرف سے جھپٹ کر آیا۔ اس شخص کے پاس پہنچا، اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر تنہا کامیاب نہ ہو سکا، نگاہ اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا مجھے دیکھ کر نظر سے نظر ملائی" پانچ سو روپے اب اتنی فرصت کب دیں گے کہ ایک غریب کی مدد کرو" ــــ ضمیر کے ان الفاظ میں ایک ایسا طنز تھا کہ میں تڑپ گیا، میرے دل و دماغ میں ایک جھٹکا سا لگا اور پھر؟ ــــ اور پھر میں نے ضمیر کی مدد سے اس شخص کو اٹھایا، اسپتال لے گیا، ڈاکٹر کے حوالے کر کے واپس ہوا تو سیدھا گھر کی طرف میرا رُخ تھا۔ میں اپنے گھر میں داخل ہونے والا ہی تھا کہ پوں پوں کی آواز کے ساتھ کامریڈ فرید صاحب نے مجھے آواز دی" کیا ووٹ دے آئے بھائی سعید صاحب!" ــــ میں جھپٹ کر گھر میں گیا پانچ سو روپے ہنوز ویسے ہی رکھے تھے، نوٹوں کی پوری گڈی کامریڈ فرید کی طرف پھینک دی اور کہا:۔

" تف ہے ایسی ممبری پر اور ووٹ دینے والوں پر" کامریڈ صاحب کو آج اتنی فرصت کب تھی کہ مجھ سے وجہ پوچھتے اور مجھے ہموار کرنے کی کوشش کرتے۔

(۱)

"السّلام علیکم چچی جان! میں آجاؤں؟"

سلام کی آواز سن کر میں نے ڈیوڑھی کی طرف نظر کی۔ چار سال کی ایک ننھی بچّی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے کہا۔ "بھئی! آؤ نا!" اجازت پاکر وہ اندر آگئی۔ اس نے پھر سلام کیا اور ایک چھوٹی سی ڈلیا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"امّی جان نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔"

میں نے ڈلیا اس کے ہاتھ سے لے لی، رومال کا ذرا سا کونا اُٹھا کر دیکھا۔ ڈلیا میں جوار کی گرم گرم کھیلیں تھیں۔ میں مسکرادی۔ میں نے ڈلیا چوکی پر رکھ دی، بچّی سے پوچھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"میرا نام نصریٰ ہے۔" اس نے بتایا۔

"تم کس کی بیٹی ہو؟"

"امّی جان کی۔"

میں پھر مسکرادی۔ "اچھا یہ بتاؤ تم رہتی کہاں ہو؟" کہنے لگی۔ "وہ جو ہے نا...... وہ

وہ جو ہے نا!" میں نے مدد دی "شاباش بھنّو! ہاں کیا ہے وہ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا "وہ بجلی کا کھمبا ہے نا! وہی میرا گھر ہے۔"

" بجلی کا کھمبا نہیں، اِدھر جائیے۔ وہیں!" بچی نے ہاتھ سے اشارہ کرکے سمجھانے کی کوشش کی،

" ہاں اچھا وہیں؟" میں سمجھ گئی" میں سمجھی تو خاک نہیں مگر اسے اطمینان دلا دیا۔ بھر ڈلیا خالی کرکے ایک چونّی دینے لگی۔ اس نے کہا" امی جان خفا ہوں گی" اور سلام کرکے پھرتی سے چلی گئی میں چونّی چٹکی میں دبائے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

" کون ہے یہ لڑکی؟ ہے تو بڑی صاف ستھری اور سلیقے کی مگر ہے کسی غریب کی بچّی! اس کی ماں ضرور مجھے جانتی ہوگی تبھی تو اُس نے مجھے یہ تحفہ بھیجا ہے۔"

میں نے سوچتے ہوئے جوار کی کھیلوں پر نظر ڈالی۔ سوندھی سوندھی خوشبو آرہی تھی۔ جی چاہا دو ایک پھنکے لگاؤں۔ مگر ڈری کہ پیٹ میں درد ہوگا۔ بجلی کے کھمبے کی طرف دیکھنے لگی" ہا! میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا" ہا، میں نے بچّی سے کہہ دیا ہوتا کہ اپنی امی کو بھیجدینا!"

(۲)

" خالہ جان! آپ نے ناحق اس غریب کو جھڑک دیا

" جھڑک نہ دیتی تو کیا اپنا دماغ چٹواتی رہتی۔"

مگر وہ تو بڑی اچھی باتیں کر رہی تھی۔ آپ مان لیتیں تو آپ ہی کا بھلا تھا۔"

" تھا تو میرا ہی فائدہ مگر برادری میں ناک جو کٹے گی۔"

" مگر کم سے کم کتاب تو نہ پھینکتیں۔"

" اوئی اللہ بلقیس! ایک آفت گئی کہ بلا بن کر آگئی۔ تو تو اب آئی ہے۔ وہ کب سے میرا بھیجا کھا رہی تھی۔"

" ہاں! میں نے اس کی ساری باتیں نہیں سنیں۔ مگر میں کہتی ہوں۔ آپ نے اس سے

اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ اب وہ آپ کے گھر کبھی نہ آئے گی۔

"اچھا ہے نہ آئے مگر وہ ایسی غیرت دار نہیں۔ دیکھنا بلقیس۔ دوسرے تیسرے روز پھر یہاں دھری ہو گی۔ اور ایک کتاب بغل میں دابے اس کی تعریف کے پل باندھ رہی ہو گی۔"

"ارے!"

"اور کیا۔ کہیں اس کے پھیر میں نہ آجانا۔"

"تو کیا ہو گا؛ میں اسے پاؤں تو گھنٹوں باتیں کروں۔ آپ نے جان پہچان بھی نہیں کرائی۔"

"چلو اچھا ہی ہوا نہیں تو اندھا کو کیا چاہئیے، دو آنکھیں۔ وہ تو ڈھونڈھتی پھرتی ہے۔"

"کیا ڈھونڈھتی پھرتی ہے؟"

کوئی ایسی باتیں سننے والی مل جائے۔"

"تو؟"

"تو یہ کہ پھر روز نہیں تیسرے چوتھے یقینی آئے گی۔ مجھ سے آپا جان کے یہاں سلام کلام ہو گیا۔ اس نے پتہ پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔ بس آ دھمکی۔ پہلے تو سمجھی۔ کوئی ملاقی ہے۔ باتیں ہی ایسی کرتی ہے۔ پھر جانا کہ "بی فاضلہ" کو الف کے نام لٹھ بھی نہیں آتا۔ مگر زبان ہے کہ قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ کچھ اور میل بڑھا تو ایک دن اجتماع میں پکڑ لے گئی میں نے اتنی ڈھیل دی تو اب کہتی ہے کہ بی بی فاطمہ کے جہیز میں مٹی کے دو گھڑے۔ ایک چکی اور یہ اور یہ تھا بھلا کہاں وہ زمانہ کہاں یہ وقت میں نے تو آج صاف کہدیا کہ چودہ سو برس کی پرانی باتیں آج کے زمانہ میں چلنے کی نہیں۔"

"آپ نے یہ بھی کہہ دیا!؟"

"میں لگی لپٹی نہیں رکھتی۔"

"مگر ایک بات وہ بھی کہہ گئی۔ آپ نے دھیان نہیں دیا۔ میں تو سُن کر لرز گئی۔"

"کیا؟"

"وہی کہ قیامت کے دن وہ تو یہ کہہ دے گی، پروردگار! میں نے تیرا حکم فلاں تک پہونچا دیا۔ اب آپ وہاں کے لیے جواب سوچ رکھیے۔"

"وہ بڑا غفور الرّحیم ہے۔ جب یہاں عزّت دی ہے تو وہاں رسول اللہ کی شفاعت سے محروم نہ کرے گا۔"

"اف.... فوہ!"

"اری بلقیس! تو اس عمر میں ان باتوں کا اثر کیوں لیتی ہے؟ جا کھیل کود جا کر!"

"خالہ جان! مجھے اس کا پتہ بتا دیجئے۔"

"گھر اس کے تو میں نہیں گئی۔ اور ان رکشا والیوں کے یہاں جاتے کون؟ تمہارے ہی قریب شیخوں کی گلی میں بجلی کے کھمبے کے پاس بتاتی ہے اپنا مکان....!"

"بجلی کے کھمبے کے پاس!!"

"اری تو تجھ سے کیا؟ تو کس سوچ میں پڑ گئی؟"

(۳)

"تو آپ انھیں جانتی ہیں؟"

"ہاں ہاں جمعہ کو وہ میرے گھر ضرور آتی ہیں۔"

"تو بتائیے ان کے بارے میں کچھ۔"

"میں نے ایسی نیک بی بی آج تک دیکھی ہی نہیں۔ محلّے ٹولے میں اپنے پرائے سب کے کام کرنے کو تیار رہتی ہیں۔ اور جب تک کام ختم نہ ہو جائے، لاکھ لاکھ کہو۔ نا بہن جانے کا نام نہیں لیتیں۔ ہیں تو وہ غریب۔ مگر کچھ معاوضہ دو تو جواب دیتی ہیں کہ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے میاں رکشا چلاتے ہیں۔ گھر میں شام کو آجاتا ہے صبر شکر کر کے کھا لیتی ہیں اور ایک آدھ روٹی بھنتو بی کو ضرور

بھیجتی ہیں، میاں سے کبھی لڑنا تو الگ رہا، روٹھتے بھی نہ سنا ننھی سی ایک بچی نصری ہے —
اسے ہر وقت اللہ و رسول کی باتیں سکھانے کی دُھن رہتی ہے۔ نصری ابھی پڑھتی تو کیا ہے، مگر اسے
بچیوں کے مدرسے ضرور بھیجتی ہیں۔ اسے مدرسے بھیجا اور خود کتابیں لیں۔ برقع اوڑھا اور کسی نہ
کسی بی بی سے مل آئیں، پیاری پیاری باتیں کیں موقع مناسب سمجھا تو ایک آدھ کتاب پڑھنے
کو دیدی۔ اور چلی آئیں۔"

"اور عادت کی کیسی ہیں؟"

"میں نے کہا نا! سن لیں کہ قرآن میں یہ لکھا ہے اور پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے
یوں فرمایا ہے تو بس پھر دنیا جہان ایک طرف اور نصیرہ باجی ایک طرف کریں گی وہی جو قرآن
و حدیث سے ثابت ہوگا۔ میں ایک قصہ سناؤں۔ ایک سپاہی نے میاں کے رکشا کا چالان کر دیا۔ لوگوں
نے سپاہی کو سمجھایا، خوشامد کی، اور دو روپیہ رشوت پر سمجھوتہ کرانا چاہا مگر میاں نے رشوت دینے
سے انکار کر دیا اور نصیرہ باجی سے آکر واردات بیان کی نصیرہ باجی نے کہا "ٹھیک کیا، جرمانہ
دس روپیہ دینا منظور، مگر رشوت دینا ایک کوڑی بھی گوارہ نہیں۔" آخر عدالت سے پندرہ
روپیہ جرمانہ ہوا۔ نصیرہ باجی نے خوشی خوشی بچی کی نتھنی اتار کر دیدی اور دو رکعت شکرانے کی
نماز پڑھی۔"

"شکرانے کی نماز پڑھی! اور انھیں رنج نہیں ہوا؟"

"نہ، رنج ان کو نہیں ہوتا۔ وہ کہتی ہیں یہ سب آزمائشیں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں،
اور اللہ جو کچھ کرتا ہے۔ اچھا ہی کرتا ہے۔ یہ تو ہے ان کا ایمان۔"

"اُف .... فوہ!" — اور کیا۔!"

"میرا ایک کام کر دیں گی آپ؟" "کیوں نہ دوں گی۔ کہئے تو!"

"نصیرہ باجی کو میرے گھر بلوا دیجئے۔"

"اوئی، میں سمجھی کوئی بڑا کام ہوگا۔ میں ابھی شوکت سے کہلوائے دیتی ہوں۔"

(۴)

"مجھے ان باتوں کا خیال بھی نہیں۔"

"مگر خالہ جان کی وہ بات مجھے بڑی بری لگی۔"

"نہیں کوئی بات نہیں۔ وہ تو بڑی اچھی بی بی ہیں۔ اس وقت نہ جانے کیوں جھنجھلا گئیں۔ شاید مجھ سے ہی بات نہیں بنی۔"

"آپ سے بات کیوں نہیں بنی؟ آپ تو اللہ رسول کی باتیں کر رہی تھیں۔"

"مگر وقت اور مزاج دیکھ کر بات نہیں کی جاتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک بات ایک وقت کہی جاتی ہے تو پسند آتی ہے۔ وہی بات ایسے وقت کہو جب کسی کے مزاج میں جھنجھلاہٹ ہو۔ تو بس الٹا اثر ہوتا ہے۔ شاید مجھ سے ایسی ہی غلطی ہو گئی۔"

"نا بہن! میں نہیں مانتی۔ خالہ جان کا مزاج ہی چڑچڑا ہے۔"

خیر ہوگا۔ مگر ان کے پیچھے کچھ نہ کہئے۔ اللہ اور رسول کو غیبت پسند نہیں حمیدہ آپا نے ایک دن قرآن پڑھ کر سمجھایا تھا کہ غیبت کرنا ایسا ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ اور آپ جانتی ہیں کہ یہ کیسی گھناؤنی بات ہے۔"

"یہ حمیدہ آپا کون ہیں؟"

"ارے آپ حمیدہ آپا کو نہیں جانتیں؟ ان کو کون نہیں جانتا۔ کیا بتاؤں ایسی اچھی ہیں وہ۔ کہ بس جی چاہتا ہے ہر وقت ان کے پاس گھسی بیٹھی رہوں۔ پڑھی لکھی اردو ہندی، انگریزی۔ فارسی۔ عربی۔ سب پڑھی ہیں۔ اور بہن قرآن تو ایسا پڑھتی ہیں کہ بس تم جانو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ملو تو خوش ہو جاؤ۔ سچ کہتی ہوں۔ ان کے پاس بیٹھ کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے۔"

"تو مجھے بھی ان سے ملاؤ۔"

"ہاں! ہاں! جمعہ کو چلنا آپ سے مل کر تو وہ بہت خوش ہوں گی۔"

"مجھ سے مل کر کیوں؟"

"وہ آپ جیسی پڑھی لکھی بہنوں سے مل کر بہت خوش ہوتی ہیں۔"

"مگر میں وہ باتیں تو نہیں جانتی جو انھیں پسند ہیں۔"

"اوئی اللہ! تو انھیں جاننا کیا مشکل ہے؟ آپ پڑھی لکھی ہیں۔ کتاب مجھ سے لیجئے۔ اس میں وہی سب باتیں لکھی ہیں لیجئے یہ رہی۔"

"مگر سُنا ہے کہ آپ تو پڑھی لکھی ہیں نہیں۔ پھر کتابیں کیوں پاس رکھتی ہیں۔"

"مجھے اللہ رسول کی باتیں جاننے کا شوق ہے۔ دین کی کتابیں منگاتی رہتی ہوں۔ آپ جیسی کوئی بہن مل جاتی ہیں تو ان سے پڑھوا کر سنا کرتی ہوں۔"

"ماشاء اللہ! مگر آپ پڑھنا لکھنا سیکھ کیوں نہیں لیتیں؟"

"بہن! بچپن سے آنکھیں کمزور ہیں۔ ڈاکٹروں نے منع کر دیا۔"

"تو آپ کو اس کا بڑا رنج رہتا ہوگا؟"

"رنج۔ رنج تو نہیں۔ مگر خیال ضرور آجاتا ہے۔ پھر سوچتی ہوں۔ اللہ کی مصلحت کچھ اسی میں ہوگی؟"

"آپ سے مل کر دل بڑا خوش ہوا!"

"تو یہ کتاب آپ پڑھیں گی نا!"

"ضرور"

"الحمد للہ"

"تو جمعہ کو لے چلئے حمیدہ آپا کے گھر۔"

"ان شاء اللہ"

(۵)

"میری بہنو! آپ اس کی فکر نہ کریں کہ آپ نے زیادہ یا کچھ تعلیم نہیں پائی آپ اس کا بھی غم نہ کریں کہ آپ کو دنیا کا تجربہ نہیں۔ آپ اس بات سے بھی ہمت نہ ہاریں کہ آپ میں مردوں جیسی طاقت نہیں۔ اور آپ اس سے بھی اپنا دل تھوڑا نہ کریں کہ آپ کے پاس پیسہ نہیں۔ اگر آپ کو آخرت کی فکر ہے تو میں آپ کو بتاتی ہوں وہاں بڑے بڑے سرٹیفکیٹ نہیں دیکھے جائیں گے۔ وہاں آپ کا تجربہ، زور و طاقت اور آپ کا مال نہیں دیکھا جائے گا۔ وہاں تو یہ پوچھا جائے گا کہ آپ نے اپنی تمام صلاحیت، چاہے وہ کم سے کم ہو، کس کام میں لگائی؟ اللہ کے کام میں کہ شیطان کے کام میں بس اس امتحان اور جانچ پڑتال میں جو پورا اترا۔ اللہ اس سے راضی ہوگا۔ اور اللہ جس سے راضی ہوگا وہ سدا کے لیے جنّت میں رہے گا۔ لیکن جو اس امتحان میں پورا نہ اترا۔ اس سے اللہ ناراض ہوگا۔ اللہ جس سے ناراض ہوگا۔ تو کھلی بات ہے کہ اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا؟

تو اے پیاری بہنو! آپ میں جو صلاحیت ہے۔ اسے اللہ کے کاموں میں لگائیے۔ اللہ کسی پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ آپ جو کر سکیں، کریں۔ اللہ نے ہم کو زندگی بسر کرنے کا جو قانون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام دیئے ہیں وہ مردوں عورتوں سب کی رعایت کر کے دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر نماز ہی کو لیجئے۔ اللہ اور اللہ کے رسول نے عورتوں کے لیے کتنی رعایتیں اس سب سے بڑے فرض میں رکھی ہیں۔ اس پر بھی ہماری کچھ تن آسان بہنوں کا کہنا ہے کہ بچوں کچوں کے ہلڑ میں کیسی عبادت اور کہاں کی نماز؟ ابھی کپڑے پاک تھے۔ ابھی بچے نے نجس کر دیئے۔ ابھی بچہ سو رہا تھا لو اب جاگ گیا اور گھر سر پر اٹھا لیا۔ اس غل غپاڑے اور ملی جلی پاکی اور ناپاکی میں یکسوئی کب حاصل ہوتی ہے کہ نماز کو نماز کے طور پر پڑھا جائے؟ مگر میں کہتی ہوں۔ اگر وہی بہنیں ایسی ہی حالت میں اللہ اور رسول کی دی ہوئی

ہیں کچھ نہیں۔" میں نے ان سے یہ حسرت بھری باتیں سنیں تو تسلّی دی اور سمجھایا کہ "بہن! اللہ علم کو نہیں عمل کو دیکھتا ہے۔ اور جس میں جتنی قوت ہوتی ہے وہ بھی اس کی نظر میں ہے یوں سمجھو۔ الف درجے کے بچّوں سے امتحان میں دو حروف پوچھے جاتے ہیں۔ چہارم درجے کے طالب علم سے حساب کتاب۔ جغرافیہ۔ تاریخ وغیرہ کے سوالات ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد امتحان لینے والا یہ دیکھتا ہے کہ کس نے کتنے نمبر لائے؟ اکثر دیکھا گیا ہے کہ الف درجے کا لڑکا اسکول بھر میں اوّل رہا۔"

مجھ سے یہ سنا تو بولیں "یہ کیسے"؟ میں نے بتایا "یہ ایسے کہ اس نے سّو نمبروں میں نوّے نمبر پائے۔ اور بڑے درجے کے طالب علموں میں کسی نے ستّر کسی نے اسّی پچاسی۔ تو رہا نا وہ اوّل۔"

بس یہ بات نصیرہ باجی کے ذہن میں بیٹھ گئی۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ دین کی موٹی موٹی سب باتیں جانتی ہیں۔ مجھ سے پوچھ پوچھ کر کتابیں منگوائیں شوہر سے بار بار پڑھوا کر سنا۔ اس طرح اس کی بھی اصلاح ہوئی۔ اور نصیرہ باجی "نصیرہ باجی" ہوگئیں۔ پھر انھوں نے ہمارے اجتماعات میں مسلسل آنا شروع کر دیا۔ وہاں آپس میں بات چیت جسے آپ تبادلۂ خیال اور ہم مذاکرہ کہتے ہیں، کر کے خوب ذہن نشیں کیا۔ اس طرح علم بڑھتا گیا۔ تو وہ اسی حساب سے عمل کرتی رہیں تو ایمان کی روشنی بڑھتی رہی۔ پھر لگی دعوت و تبلیغ کی آگ یہ آگ جب لگتی ہے تو خواہشات کے سارے کھلیان کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ نصیرہ باجی کا اب یہی حال ہوگیا ہے اور اب اُن کے سامنے یہی مقصد رہ گیا ہے کہ کس طرح دین کی باتیں دنیا میں پھیلیں اور کیسے اللہ کا دین غالب ہو؟

نصیرہ باجی کا طریقہ بھی خوب ہے کسی بہن کے یہاں پہنچیں۔ وہ دین کی باتوں سے واقف نہیں۔ دو ایک ملاقاتوں کے بعد اُس سے کہنے لگیں "بہن میں پڑھنا نہیں جانتی۔ آپ اس کتاب میں سے دین کی کچھ باتیں پڑھ کر سنا دیں" اب وہ بہن تو کتاب پڑھتی ہے

اور نصیرہ باجی کی نظر اس کی پیشانی پر ہے۔ بلا کی قیافہ شناسی آگئی ہے ان میں فوراً بھانپ لیتی ہیں۔ کہ کتاب پسند آئی یا نہیں۔ پھر مجھ سے مشورہ کرتی ہیں۔ اور پھر جسے اللہ کو راہ دکھانا منظور ہوتا ہے، وہ راہ پر لگ جاتی ہے۔"

"ایک دن میری خالہ نے ان کو بری طرح جھڑک دیا تھا۔"

"ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ مگر اللہ کی رضا حاصل کرنے والی اس سے رنجیدہ نہیں ہوتی۔ وہ تو یہ سمجھتی ہے کہ اجر کا دینے والا اللہ ہے۔"

"سچ ہے۔"

اور آپ تو جھڑکنے کو کہتی ہیں۔ ایک بار ایک عورت نے ایسی گندی گندی گالیاں دیں کہ توبہ۔ مگر شاباش ہے نصیرہ باجی کو، سب پی گئیں۔ جیسے سنا ہی نہیں۔ بعض جگہ بنائی بھی خوب جاتی ہیں۔ مگر جمی رہتی ہیں۔ میرے اللہ تبلیغ کا جوش بھی تو اتنا ہے بندی میں کہ کیا کہوں۔ منع کرتی ہوں کہ اپنی ملنے جلنے والی بہنوں میں کام کرو۔ مگر نا بہن! ایک دن ہیں گرلس اسکول کی ہیڈ معلمہ مسِ ارشاد سے ملنے گئی۔ دیکھا تو وہاں نصیرہ بیگم براجمان ہیں۔ آپ مسکراتی ہیں۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آئی تھی۔ معلمائیں نصیرہ باجی کو بنا رہی تھیں۔ برقع اور پردہ پر پھبتیاں کس رہی تھیں۔ مگر یہ تھیں کہ پردے کے فائدے ان کو سمجھا رہی تھیں اور پوچھ رہی تھیں کہ یہ بتاؤ "پردے کے بغیر عورت عورت ہی کب رہتی ہے؟"

نصیرہ باجی کے اس پوشیدہ نشتر کی چبھن کو معلماؤں کا دل ہی جانتا ہوگا ان کے پاس اس کا جواب ہی کیا تھا۔ مگر اپنی جھینپ مٹانے کو مذاق میں بات ٹال رہی تھیں۔ اتنے میں میں پہونچ گئی اور پردے کی حمایت میں بولنے لگی۔ مس ارشاد نے مجھے دیکھا تو انٹرول ختم ہونے کی گھنٹی بجوا دی۔ معلمائیں اپنی اپنی کلاس میں چلی گئیں۔ میں نصیرہ باجی کو لے کر مس صاحبہ کے دفتر میں جا بیٹھی۔"

"سبحان اللہ! آپا! یہی نہیں، ان کی عادت بھی بہت اچھی ہے۔ ہیں غریب، مگر تحفہ

کے ذریعہ ربط بڑھانے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔ میرے دل میں ان کی جوار کی کھیلوں نے ہی جگہ پیدا کی۔"

"آپ نے ربط بڑھانے اور دل میں جگہ پیدا کرنے کا نام لیا میں اس کا بھی واقعہ سناؤں!

ایک دن میں ڈپٹی عبدالحمید صاحب کے یہاں ان کی بیوی سے ملنے گئی۔ دیکھا تو نصیرہ باجی ڈپٹی صاحب کی چھ سات برس کی بچّی سے گھل مل کر صحن میں ہنس بول رہی ہیں بچّی کو ایک منّی سی کتاب کا ٹائیٹل دکھا کر کہہ رہی تھیں" دیکھو بیٹی! کیسی اچھی کتاب ہے یہ۔ ذرا پڑھ کر سناؤ تو۔ میں نے مسکرا کر سلام کیا تو پاس آکر کان میں بولیں "آپا! ڈپٹیائن بڑی مغرور ہیں۔ مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں۔ میں نے سوچا۔ ان بچوں ہی کو ذرا پیار کرلوں۔"

یہ ہے نصیرہ باجی کے ربط بڑھانے کا ڈھنگ بچّوں میں بچہ۔ جوانوں میں جوان۔ بڑی بوڑھیوں میں بڑی بوڑھی۔"

"یہ سب اللہ کی توفیق ہے۔"

"مگر یہ تو سوچئے کہ جب آخرت میں اللہ تعالیٰ نصیرہ باجی کو گواہ کے طور پر کھڑا کر کے ہم پڑھے لکھوں سے پوچھے گا کہ ایک یہ ہے اور ایک تم۔ اس نے اَن پڑھ ہوتے ہوئے یہ یہ کیا، یہ کیا۔ تم نے کیا کیا؟۔ تو ہم سے کیا جواب بن پڑے گا۔"

"اُف .... فوہ!"

"امّی جان! کیا تھا؟"

"اری ہٹ! جا بھاگ یہاں سے، مسالہ پیس جا کر۔"

میں جا کر مسالہ پیسنے لگی، لیکن میرے کان اسی طرف تھے۔ امی جان پڑوسن سے باتیں کر رہی تھیں۔

"ہائے بہن! ظالم نے کیسا بے دردی سے مارا ہے بے چاری کو۔"

"اے بہن! تم تو بعد میں پہونچی تھیں۔ میں تو پہلے سے دیکھ رہی تھی۔ کوئی بات بھی ہوتی!"

"بات کیا تھی آخر؟"

کچھ نہیں، شمن نے کہا نمک نہیں لائے؟ بس پل پڑا۔ اب وہ باہر سے نہ جانے کس سے لڑ کر آیا تھا، غصہ اتارا غریب بیوی پر۔"

"بس اتنی بات پر۔"

"ہاں اور کیا بہن! کہتا ہے کیا تمہارے باپ کا نوکر ہوں۔"

"نوکر! واہ، کیا گھر کا کام کرنے سے کوئی بیوی کا نوکر ہو جاتا ہے۔"

"نوکر ووکر کچھ نہیں، شیطان کو بہانہ چاہیے۔

"ارے میں کہتی ہوں، اتنی سی بات پر کان پھاڑ دیے۔ بال نوچ ڈالے گال لال کر دیے۔"

میں مسالہ پیستے پیستے رک گئی۔" کان پھاڑ دیے، بال نوچ ڈالے۔ گال لال کر دیے۔"

میں کانپ گئی۔ مجھے خیال آیا۔ امی اور ابا جان ایک رات کھسر پھسر میری شادی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ منی سو گئی ہے۔ مگر میں تو سب سن رہی تھی۔"

"اری تو اِدھر دیکھ رہی ہے کہ مسالہ پیس رہی ہے جلدی سے ہنڈیا چڑھا دے وہ تو آتے ہی ہوں گے۔ آتے ہی کھانا مانگیں گے۔ دیر ہوئی تو ہڈی پسلی توڑ دیں گے میری اور پھر میں ٹھیک کروں گی تجھے۔" امی نے مجھے ڈانٹا اور میں "گھر، گھر، گھس گھس" میں پھر مسالہ پیسنے لگی۔ مجھے یاد آیا" ایک دن کھانا دیر میں پکایا تھا۔ تو ابا جان نے امی جان کے گال پر دو تھپڑ رسید کیے تھے امی جان کے گال پر پانچوں انگلیاں بن گئی تھیں وہ تو اور پیٹتے۔ میں بیچ میں جا پہونچی ابا جان کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ میں نے جلدی جلدی مسالہ پیسا۔ دوڑ کر ہنڈیا چڑھائی۔ مار پیٹ کے ڈر سے میں نے اپنے ابا کے آنے سے پہلے پہلے کھانا تیار کر دیا۔ ابا جان آئے تو کھانا ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ابا جان نے پہلا لقمہ منھ میں رکھا منھ میں لقمہ رکھتے ہی "اخ" لقمہ تو انھوں نے اگل دیا اور رکابی امی کے اوپر دے ماری" ہائے ابا" میں چلائی" ابا کھانا میں نے پکایا تھا مجھے پیٹ لیجیے۔"

"ارے تو کیا اس کم بخت سے نمک بھی چکھا نہیں جاتا۔"

"امی جان کی طبیعت آج صبو (صبح) ہی سے خراب ہے۔" میں نے جھوٹ بول دیا

اور اس جھوٹ سے امی جان بچ گئیں۔

امی جان نے چھینکے پر سے گڑ اتارا۔ ایک طشتری میں اس کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں کر کے رکھیں۔ ذرا سا گھی بھی ملا دیا۔ ابا جان نے اسی سے روٹی کھائی۔

کھانا کھا کر لیٹ گئے۔ میں پنکھا جھلنے لگی۔ امی جان پان بنانے لگیں ابا جان نے پان کھایا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد جب ذرا ان کے تیور ٹھیک ہوئے تو بولے:۔

"منی کی ماں! سنا کچھ؟"

"کیا ہوا؟"

"نواب نے طلاق دیدی"

"طلاق!!" امی جان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"آخر نواب کرتا کیا؟ لاکھ سمجھایا، چھت پر سے پڑوسن سے باتیں نہ کیا کر۔ نذیرن مانی نہیں۔ سمجھایا۔ ڈرایا۔ دھمکایا۔ مارا پیٹا۔ آخر طلاق کی نوبت آگئی"

امی جان چپ سادھے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ میں سوچ رہی تھی یہ کیا بات ہوئی پڑوسن سے بات کرنے پر ڈرانا۔ دھمکانا۔ مارنا پیٹنا پھر طلاق، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر مرد بیوی پر کیوں جھلاتے ہیں؟ میں سوچ رہی تھی کہ میری شادی کی فکر ماں باپ کو ہے۔ ایک دن امی جان ابو میاں سے کہہ رہی تھیں "آخر تم کو کب خیال آئیگا؟ لڑکی کی ذات کھیرا ککڑی کی طرح بڑھ رہی ہے فکر ہی نہیں۔ کہیں کھوج لگاؤ۔ کوئی اچھا سا لڑکا...."

اتنے میں پہونچ گئی۔ امی جان چپ ہو گئی تھیں۔

اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد کچھ عورتیں ہمارے گھر مہمانی میں آئیں۔ امی جان نے ان سے میری بڑی تعریف کی۔ میرے اٹھنے بیٹھنے کی تعریف۔ میرے کام کاج کی تعریف میرے چال چلن کی تعریف غرض یہ کہ میں کن کن تعریفوں کا ذکر کروں۔ بس یوں سمجھنا چاہئیے

کہ تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں "میری بچی بالکل بے زبان ہے، چاہے جو کہہ لو آدھی بات منھ سے نہیں نکالے گی. کام کاج میں اتنی تیز کہ صبح سے شام تک کرتی ہے اور تھکتی نہیں۔ اب تو میں نے سارا گھر اسی پر چھوڑ دیا ہے. اللہ کا شکر ہے۔ اسے گھر کرنا آگیا۔

میں دل ہی دل میں ہنس رہی تھی. امی جان روپے میں سولہ آنے جھوٹ بول رہی تھیں. میں جو کچھ تھی اس کا الٹا امی جان کہہ رہی تھیں۔ امی جان نے بتایا "منی بے زبان ہے" مگر میں تو خود انھیں سے خوب زبان لڑاتی ہوں انھوں نے بتایا منی کام کاج اور کھانے پکانے میں بڑی ہوشیار ہے۔" حالاں کہ ابھی پرسوں نرسوں ہی میرے کھانے کی "ہوشیاری" کی وجہ سے ابا جان نے ترکاری کی طشتری امی جان کے سر پر دے پٹکی تھی۔ اور تو اور سفید جھوٹ امی جان نے یہ بھی بتایا کہ "منی پڑھی لکھی بھی ہے" اوئی اللہ لکھنا مجھے کہاں آتا اور پڑھائی بھی کیا، چار برس سے پڑھ رہی ہوں۔ اور الف لام میم (الم) کا پارہ بھی ختم نہیں ہوا۔

غرض یہ کہ اس دن امی جان خوب جھوٹ بولیں۔ دو گھنٹے سب عورتیں رکیں کچھ دنوں کے بعد کہیں سے ایک رقعہ آیا. وہ سرخ رومال میں لپٹا ہوا تھا. ماموں جان آئے۔ ابا جان نے انھیں رقعہ دکھایا۔ بڑے ابا آئے۔ ان کو دکھایا خالو جان کو دکھایا اور دھیرے دھیرے جانے کیا باتیں کیں" ہاں ہاں ٹھیک ہے بہت ٹھیک" یہ لفظ میرے کان میں بھی پڑ جاتے تھے۔

اس کے دوسرے تیسرے ہی دن سے امی جان اور ابا جان کچھ پریشان اور متفکر نظر آنے لگے. میرا پڑوس میں آنا جانا بند ہو گیا، اور لیجئے مجھے سب معلوم ہو گیا. مشرف جہاں ایک دن آئی۔ وہ من ہی من میں خوب ہنس رہی تھی. میں نے پوچھا کیوں کھلی جا رہی ہو؟ "بولی" میں کھلوں کیوں نہیں تو جو پھول بننے والی ہے" اور اس کے بعد مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا. یعنی یہ کہ میری شادی طے ہو گئی. مشرف جہاں سے اپنی شادی کا طے ہونا سنا تو میرا سر گھوم گیا. میری نظر میں محلہ ٹولہ۔ اور رشتے کے تمام عورتوں کے شوہر پھرنے لگے. اس نے

اپنی بیوی کا سر پھوڑ دیا تھا۔ اس نے بال نوچ ڈالے تھے۔ کان زخمی کر دیا تھا اور وہ جو ہے غفور، وہ بڑا ظالم ہے۔ کیسی بے دردی سے پیٹتا ہے ظہورن کو "میرا شوہر بھی مرد ہوگا" میری زبان سے نکل گیا۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ مشرف جہاں پاس بیٹھی ہے۔ اس نے جو سنا تو خوب ہنسی بولی۔ "دیوانی شوہر مرد نہیں ہوتے تو کیا عورت ہوتے ہیں؟" اپنی حماقت پر میں بھی ہنس دی میں گھبرا بہت رہی تھی مگر میرے گھبرانے سے کیا ہوتا ہے۔ میری شادی ہوئی جس وقت مجھے گھر، محلے اور رشتے کے لوگ رخصت کر رہے تھے تو میں بے اختیار رو رہی تھی۔

میں نے پہلے پہل جب اپنے شوہر کو دیکھا تو مجھے بڑا ڈر لگا۔ میں کانپ گئی تھی تو وہ گورے چٹے بھری بھری داڑھی۔ سُرخ و سفید گال۔ اچھا سڈول جسم۔ مگر میرے دل میں پہلے سے جو خوف سمایا تھا۔ اور بہت سی عورتوں کے شوہروں کے ظلم دیکھ اور سُن چکی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ اس خوبصورت مرد کے اندر وہ شوہر چھپا ہے جس کے طمانچوں، گھونسوں اور لاتوں سے میری ہڈیاں چور چور ہو جائیں گی۔ میں کانپ ہی تو گئی۔ مگر میں جھوٹ بول کر اپنی عاقبت خراب نہ کروں گی۔ مجھے تجربہ الٹا ہوا۔ آج تین برس شادی کو ہو چکے۔ میاں نے آدھی بات بھی مُنھ سے نہیں نکالی۔

ایک دن میں دال بگھار رہی تھی۔ کرچھے میں گھی گرم ہو چکا تھا۔ اس میں پیاز ڈالی۔ پھر جو اُٹھایا تو بغیر کپڑے کے کرچھے کو پکڑ لیا "اف اللہ میرا ہاتھ جل گیا۔ گھی الٹ کر آگ پر گیا۔ اور بھق سے جل اُٹھا۔ میں ڈری۔ اس لیے نہیں کہ جل گئی تھی بلکہ اس لیے کہ اب مار پڑی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا وہ آنگن میں بیٹھے قرآن پڑھ رہے تھے "بھق" کی آواز سُن کر فوراً نظر اُٹھائی۔ قرآن رکھ کر جھپٹے میں چیخی معاف کیجئے غلطی ہو گئی۔" مگر ارے یہ کیا؟ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے دیکھ رہے تھے اور پوچھ رہے تھے "جلی تو نہیں" میں نے یہ لفظ سنتے تو اللہ کا شکر ادا کیا۔ ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ خیر ہاتھ تو کچھ یونہی جلا تھا مگر

نے مجھ سے کہا "جلی تو ذرا سا ہوا اور چیخیں اتنی زور سے" اور پھر مسکرا کر اپنی جگہ جا بیٹھے اور قرآن پڑھنے لگے۔

میں حیران تھی کہ یہ کیا ہوا؟ میں ڈری تو کسی اور بات سے تھی اور وہ سمجھے کچھ اور۔ میں نے کچھ نہیں بتایا۔ ایک دن پانی سے بھرا لوٹا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ان کے پیر کے انگوٹھے پر گرا۔ انگوٹھا پچک گیا۔ انھوں نے کہا "اُف! مار ڈالا" اور میں مارے خوف کے بیہوش ہونے لگی کہ آج بغیر پٹے نہ بچوں گی مگر ہوا کیا؟ وہ مجھے لڑکھڑاتے دیکھ کر اپنی چوٹ بھولے مجھے سنبھالا۔ چارپائی پر لٹا دیا اور پوچھا "چوٹ تو مجھے لگی ہے تم کو کیا ہوا؟" اپنے انگوٹھے پر ٹنکچر لگا لیا۔ اور مجھے کچھ نہ کہا۔ میں اُس دن بھی حیران ہی رہی۔

ایک دن کھانا پکانے میں میرا دوپٹہ جل گیا۔ ایک دن شیشے کا گلاس ٹوٹ گیا۔ ایک دن ان کے بستر پر پاندان اُلٹ گیا۔ اور ساری چادر خراب ہو گئی۔ لالٹین کی چمنیاں تو آٹھویں دسویں روز ٹوٹتی رہتی تھیں۔ گوشت اکثر جل جاتا۔ دو ایک بار دال میں نمک ہی نہ ڈالا۔ کھاتے ہوئے مسکراتے اور کچھ نہیں کہا۔ اور بتاؤں ایک دن میں ان پر خود غصے ہوئی۔ لال دوپٹے کے لیے انکے پاس پیسے نہیں تھے اور مجھے ضد ہو گئی کہ جب تک لال دوپٹہ نہیں آئے گا، میں ان کی ماموں زاد بہن کی شادی میں نہیں جاؤں گی آخر انھوں نے لا کر دیا۔

اب تو مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید شوہر میں ہوں اور وہ بیوی۔ میری ضد اور میرا غصہ اکثر ابھرا۔ مگر جب ایسا ہوا تو وہ قرآن پڑھنے لگے یا باہر چلے گئے اور پھر آئے تو ہنستے ہوئے۔ گھر میں جب داخل ہوتے۔ ہمیشہ سلام کرتے میں سخت حیران تھی کہ میرا شوہر مجھ پر غصہ کیوں نہیں کرتا؟ میری خطاؤں پر کیوں نہیں جھلاتا۔ کئی بار سوچا لاؤ پوچھوں۔ مگر جرأت نہ کر سکی ایک دن میں نے کہا "سُنا آپ نے؟"

"کیا؟" وہ میری طرف دیکھنے لگے۔

"رشید نے اپنی بیوی کو مارا پیٹا اور گھر سے نکال دیا" میں نے پڑوس کا قصہ سنایا۔

"استغفراللہ! بہت برا کیا۔"

پھر وہ باہر گئے رشید کو دیر تک سمجھاتے رہے اور اسے مجبور کیا کہ صالحہ کو لے آئے اور کبھی اس پر سختی نہ کرے۔

ایک دن میں نے پھر کہا۔

"تراب بڑا خراب آدمی ہے۔"

بولے "کسی کی غیبت نہ کرو۔ اللہ اور رسول نے منع کیا ہے۔"

"سنئے تو، طاہرہ کی ماں بیمار ہے، اور تراب اسے جانے نہیں دیتا، کیا سچ بھی کہو! تب بھی غیبت ہے۔"

بولے "ہاں یہی تو غیبت ہے۔"

"اچھا تو خدا بخش کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"خدا اسے معاف کرے اور سمجھ دے۔"

"اور حیدر؟"

"اسے بھی اللہ ہدایت دے۔"

"اور صفدر اور اکبر اور . . . !"

"ارے ارے آج تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ اپنی فکر کرو۔ دوسروں کے پھیر میں کیوں پڑی ہو؟"

"میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھو۔"

میں پھر بھی نہ بولی۔

تکیہ

"نا بہن! اب مجھ سے یہ پاپڑ نہ بیلے جائیں گے پھر اکیلی جان ہو تو کوئی بات بھی نہیں میرے اس منے کی کھکھیڑ کون اٹھائیگا؟ بہتوں کو دیکھا، بھری گود ہونے پر بیاہ رچایا پر سُکھ نہ اُٹھا سکیں جس کو دیکھا پچھتاتے دیکھا۔ جب تک بچے کا بچپنا رہا، غیر مرد کی مار کھاتا رہا اور سخت سُست سُنتا رہا غریب ماں یہ سب کھلی آنکھوں دیکھتی اور دل ہی دل میں کڑھتی رہی، اب بولے تو کیا بولے؟ یہ پاؤں کھولے تو لاج، اچھا، پھر بچہ جیسے تیسے جی بھی گیا، بڑا ہوا، کچھ عقل آئی تو اب اس بنا پر ماں سے ناراض کہ دوسری شادی کیوں کی۔ تو بہن! میرے سامنے تو جب کوئی دوسری شادی کا نام لیتا ہے تو میرا دل جل کر رہ جاتا ہے میں کانوں پر ہاتھ رکھتی ہوں۔ نا بابا! پڑی تو ہوں ایک کنارے سکھ سے سمجھیں بہن آپ میرا مطلب!؟"

یہ اور اس طرح کی باتیں بدلیا ہر اس اپنی پڑائی، بڑی بوڑھی اور جوان عورت سے کرتی جو اُس کے سامنے اس کے دوسرے بیاہ کی بات چھیڑتی۔ اگر کوئی بے تکلف سہیلی کہتی کہ "پھر پہاڑ سی جوانی کیسے کٹے گی۔

تو جواب دیتی "تم میری جوانی کو پہاڑ پہاڑ کہہ کے مجھے کیا ڈراتی ہو؟ ہاپنے وہ جس کا پیر کاپنے، دیکھنا میں اسی طرح بے داغ زندگی نہ گذار دوں تو تھوک دینا منھ پر۔"

ایک بار اس کی ایک قریبی سکھی نفیسن کی زبان سے کہیں یہ نکل گیا کہ "بوبو کیا سچ مچ بیاہ نہ کرو گی؟ گھر تو بالکل سونا سونا لگ رہا ہے، گھر کی رونق مرد سے ہوتی ہے آخر تمہارے ہاتھ پاؤں تھکیں گے تو کیا کرو گی؟ تو بدلیا نے چمک کر جواب دیا "اری ہٹ! سونا سونا گھر تجھے لگتا ہوگا۔ بڑے پیر کا سایہ بنا رہے۔ میرا منّا جیتا رہے میرے گھر کی رونق اس کے دم قدم سے ہے، بڑا ہوگا، کمائے گا، کھلائے گا، میں اس کا بیاہ رچاؤں گی" اس کے سر سہرا دیکھوں گی کوئی اچھی سی دلہن بیاہ لاؤنگی بس پھر رونق ہی رونق ہے، میرا منّا آج ایک پودا ہے۔ ایک نہ ایک دن بڑھ کر گھنا پیڑ ہوگا۔ دیکھنا، اس کی چھاؤں میں کس مزے سے سکھ کی نیند سوؤں گی۔"

اور یہ کہتے کہتے بدلیا اپنے چھ سات ماہ کے منّے کو چومنے اور اس کی بلائیں لینے لگتی اس نے منّے کی زندگی کے لیے بڑی بڑی احتیاطیں کر رکھی تھیں، وہ ہر جمعرات کو کرامت شاہ کی درگاہ کو ملیدہ ضرور بھیجتی، ہر پیر کو بڑے پیر کی فاتحہ ضرور دلاتی بچے کے گلے میں نہ جانے کتنے تعویذ لٹکا رکھے تھے۔ نظر نہ لگنے کے لیے کالا دھاگا گلے میں ڈال رکھا تھا اور بازو پر شہید بابا کے مزار والا سوا روپیہ کا گنڈہ بھی باندھ دیا تھا۔ ہر اتوار کو مرچیں منّے کے سر پر اتار کے آگ میں جھونکا کرتی اور یہ سب تدبیریں کرنے کے بعد ایسا مطمئن ہوتی جیسے اس کے منّے کو کوئی ٹیڑھی نگاہ نہیں دیکھ سکتا اور پھر اپنے بچے کے مستقبل کے بارے میں اپنی زندگی کے خوشگوار خواب دیکھا کرتی۔

بیٹے کی آئندہ زندگی اور موہوم مستقبل سے آس لگائے بدلیا تن من سے اس کی پرورش میں لگی تھی۔ اس کی نظر اور توجہ ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر منّے پر جم جاتی اور پھر وہ راتوں کو نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھا کرتی۔ کبھی وہ دیکھتی کہ ایک باغ و بہار

پھلواری میں ٹہل رہی ہے کبھی دیکھتی کہ وہ ہاتھی پر سوار ہے اور کبھی دیکھتی کہ اس کا بیٹا تاج پہنے ایک تخت پر بیٹھا ہے اور بہت سے غلام اور لونڈیاں خدمت میں موجود ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ بدلیاں ان خوابوں کو آئندہ کے لیے پیشین گوئی سمجھتی۔ اپنی پرائی اور بوڑھی، جوان ہر اس عورت سے یہ خواب کہا کرتی جو اس سے ملتی اور دل ہی دل میں خوش ہو ہو کر منّے کو چٹ چٹ پیار کرتی، اور بلائیں لیتی اور پھر دوسرے تیسرے دن منّے کے تعویذوں اور گنڈوں میں دو ایک کا اضافہ اور ہو جاتا کچھ بوڑھی اور تجربہ کار عورتیں یہ سب دیکھ کر دبی زبان میں کہہ جاتیں کہ اس بدلیا کو تو بیٹے پر ایسا تکیہ ہے جیسے وہی اس کا روزی دینے والا بنے گا۔"

ان باتوں کی بھنک اگر بدلیا کے کانوں میں پڑ جاتی تو گھر چڑھ کر خوب لڑتی اور گالیاں دے دے کر جبتک بھڑاس نکال کر تھک نہ جاتی، واپس نہ آتی۔

اللہ کے کارخانہ کو اللہ ہی جانے۔ ایک دن بدلیا اپنے دو چھپرے میں بیٹھی گیہوں بنا رہی تھی۔ بچہ آرام سے کھٹیا (بانس کی چارپائی) پر میٹھی نیند سو رہا تھا منّا سا تکیہ اس کے سرہانے تھا منّا جب کروٹیں لیتا یا کنمناتا تو بدلیا کی نگاہ اس طرف اٹھ جاتی اور کبھی وہ دو ایک ہاتھ پنکھا جھل دیتی اور کبھی مہین کپڑا اس پر ڈال دیتی اچانک اس نے شور سنا۔ بہت سی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں "دوڑو آگ لگی"، بدلیا گیہوں چھوڑ کر دو چھپرے سے نکلی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کہاں آگ لگی ہے۔ صحن میں کھڑی ہو کر اس نے دیکھا تو اس کے گھر سے دو تین گھر چھوڑ کر ہی ایک مکان سے شعلے اٹھ رہے تھے، دوپہر کا وقت تھا، مئی کا مہینہ، ایک تو ویسے ہی لو سے ہر چیز جھلسی جا رہی تھی آگ لگی تو ہوا کے جھونکے تیز سے تیز تر ہو گئے اہلِ محلّہ دوڑ دوڑ کر آگ بجھا رہے تھے کوئی پانی چھڑکتا اور کوئی سامان نکالنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک آدمی نے باہر چوپال کو جلتے دیکھا تو بڑی تیزی سے اس نے چھپر

کے بند کاٹ دیے چوپال کا ایک چھپر جلتے جلتے گرا تو اسکی چنگاریاں اڑیں اور پھر کئی اور گھر چنگاریوں کی زد میں آگئے۔

بدلیا بڑی سیانی تھی اس نے یہ دیکھا تو گھر میں جو پانی سے بھرے گھڑے رکھے تھے اس نے اپنے دو چھپرے پر چھڑکنا شروع کر دیئے لیکن اس غریب کو کیا معلوم کہ اس طوفانی آگ میں چند گھڑے پانی کی حقیقت ہی کیا۔ کچھ چنگاریاں اس کے دو چھپرے کے پچھلے حصہ پر آگریں اور پلک جھپکتے آگ سارے دو چھپرے پر پھیل گئی اور وہ جلنے لگا۔ چھپر کے بانس تڑ تڑ چٹخنے لگے۔ اب تو بدلیا گھبرائی اسے اپنا بچہ یاد آیا، وہ جھٹ دو چھپرے کے اندر گھس گئی۔ اس نے اپنے جلنے کی ذرا بھی پروانہ کی، اس نے دو چھپرے کے اندر رکھے ہوئے کسی سامان پر نظر تک نہ ڈالی وہ نہایت تیزی کے ساتھ مُنّے کی کھٹیا کی طرف بڑھی۔ مُنّا ہنوز بے خبر تکیئے سے الگ کروٹ لیے پڑا سو رہا تھا۔ بدلیا نے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اس نے جھپٹ کر مُنّے کو اٹھایا۔ اور چھاتی سے لگائے ہوئے باہر نکل آئی محلّے کے کچھ لوگ پانی سے بھری بالٹیاں اور گھڑے لیے اس کے آنگن میں آگئے اور پانی چھڑکنے لگے لیکن ان کی کوششیں ناکام ہوگئیں۔ بدلیا کا دو چھپرا دیکھتے دیکھتے جل کر بیٹھ گیا مگر بدلیا بڑے دل گردے کی عورت تھی وہ اپنی اس کامیابی پر خوش تھی کہ وہ بچّے کو صحیح سالم نکال لائی۔ اب چاہے گھر جلے یا رہے اچانک اس کے پاس کھڑی ہوئی ایک عورت نے اس سے کہا:۔

"اری بدلیا! تو یہ کیا اٹھا لائی؟ اری اندھی! تو کسے چھاتی سے چمٹائے ہے؟"

اس عورت کے کہنے سے بدلیا نے اپنے مُنّے کی طرف دیکھا۔ وہ دیکھتے ہی چیخ پڑی، اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ تکیہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔۔۔ (بدحواسی میں وہ اپنے مُنّے کے بدلے تکیہ لپیٹ کر بھاگ آئی تھی)

بدلہ

"کملا پاگل ہو گئی" "ہائے اللہ! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"
"میں سچ کہہ رہا ہوں" "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"
"میں نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" "کیا دیکھا ہے آپ نے؟"
"میں نے دیکھا کہ اس کا جمپر چیتھڑے چیتھڑے، اس کی ساڑی نُچی اور پھٹی ہوئی۔ لڑکے اُسے ڈھیلے مار رہے تھے اور وہ گالیاں بک رہی تھی۔"

وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ گلی میں اخوان الشیاطین کا شور ہوا "ڈائن ہے، بُھتنی ہے، بھاگو بھاگو" اور اس ہلڑ کے ساتھ ہی میرے گھر کے دروازے کے کواڑ دھڑاک سے ہوئے اور کملا سچ مچ بھتنی بنی ہوئی، پریشان حال، اُلجھے ہوئے گرد سے اٹے بال، نیم برہنہ دونوں ہاتھوں میں پتھر کے ٹکڑے لیے ہوئے اور وحشت زدہ میرے گھر کے صحن میں آ گئی۔ ایک نظر اس نے مجھے اور میں نے اُسے دیکھا پتھر کے ٹکڑے اس کے ہاتھوں سے آپ ہی آپ چھوٹ کر زمین پر گر پڑے اور کملا سکتے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جیسے اُسے کوئی بھولی ہوئی بات اچانک یاد آ گئی ہو۔ میں نے بڑھ

کر اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا: "کملا، میری پیاری سہیلی کملا! آؤ بیٹھو، تمہارا کیا حال ہے؟" اور میں اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ وہ اب بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ جیسے اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ ننھے کے ابا ننھے کو لیے ہوئے تھے، اسی طرح وہ باہر چلے گئے۔

میں نے کملا کو لا کر تخت پر بٹھا دیا، وہ بیٹھ گئی مگر ٹکر ٹکر دیکھنے کے سوا اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ ننھے کے لیے دودھ رکھا تھا میں نے فوراً گرم کر کے کملا کے سامنے پیش کیا: "کملا لو دودھ پی لو۔" اس نے منھ کھول دیا، میں نے دودھ کی پیالی اس کے منھ میں انڈیل دی۔ دودھ پی کر اس کے حواس کچھ کچھ درست ہوئے وہ حیران حیران مجھ کو اور میرے گھر کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

میرے پاس بکس میں دو ساریاں رکھی ہوئی تھیں جو رمیش چچا نے جہیز میں دی تھیں وہ ساڑیاں ویسے ہی تہ کی ہوئی رکھی تھیں میں نے ایک نکالی، اپنا سب سے اچھا جمپر نکالا، غسل خانے میں کپڑے اور گرم پانی تولیہ اور صابن وغیرہ رکھ دیا۔ پھر کملا سے کہا: "بہن غسل کر لو، اللہ تم پر رحم کرے۔" اس نے کچھ کہے بغیر جا کر غسل کیا۔ غسل خانے سے نکلی تو پھر وہ میری پرانی کملا تھی۔ میرے گلے لگ کر خوب روئی۔ دل کی بھڑاس کچھ نکلی میں نے چائے پلائی چائے پی کر کچھ سنبھلی۔

مغرب میں پانچ چھ منٹ باقی تھے، ننھے کو لیے "وہ" گھر واپس ہوئے تو کملا کو نئی ساری زرق برق پہنے دیکھ کر جھجکے سمجھے، شاید کوئی اور مہمان ہے، لیکن کملا نے اٹھ کر اپنے قاعدے سے انھیں نمستے کیا تو انھوں نے پہچانا۔ ننھے کو کملا نے گود میں لے لیا ننھے بھی اس کی گود میں جا کر اُچکنے لگا اتنے میں اذان ہوئی، وہ ادھر گئے اور میں تخت پر جا کر اللہ کے حضور کھڑی ہو گئی۔ کملا بچے کو کھلاتی رہی اور مجھے دیکھتی رہی۔

مغرب کے بعد "وہ" بھی آ گئے۔ ان کو کھانا میں نے کمرے میں دے دیا اور کملا کو لے کر خود کھانے بیٹھ گئی۔ کملا کھاتی جاتی اور کچھ سوچ سوچ کر آنسو بہاتی اور بیتی جاتی

میں اس کے جذبات پڑھ رہی تھی۔ میں نے جی میں کہا "سلمیٰ! اس وقت چپ ہی رہو، ایسا نہ ہو اُونگئے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو میرے پوچھنے پر اس کے جذبات بے قابو ہو جائیں"۔ لہٰذا میں خاموش ہی رہی اُس نے پیٹ بھر تو نہ کھایا، مگر خیر تسلی ہو گئی۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر، میرا تو خیر تجربہ ہے، مجھے نہیں معلوم کہ کہنے والے نے یہ بات تجربے کے بعد کہی ہے یا یوں ہی روا روی میں اس کی زبان سے نکل گئی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ محبت اور پیار کی باتیں جو پھول سے بھی زیادہ لطیف اور نازک ہوتی ہیں، سنگ دل سے سنگ دل اور وحشی سے وحشی انسان پر بھی اثر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ کملا تو پھر عورت تھی۔ عورت ذات یوں بھی دل کی نرم جذباتی اور محبت کی بھوکی ہوتی ہے۔ میں نے جو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پریم کے پھول اُس پر پھینکے تو وہ موہ گئی۔ اب نہ وہ پاگل تھی نہ ہسٹری۔ وہی میری پرانی سہیلی کملا تھی جو عشاء کے بعد میرے پلنگ کے پاس دوسرے پلنگ پر لیٹی رو رو کر اپنی بپتا سنانے کو تیار ہو گئی۔ اس نے کہا:۔

"سلمیٰ دیدی! تم نے مجھے کیسا کیسا بنا سنوار کر کیسے کیسے ارمانوں سے دُلہن بنایا تھا، پھر میرے بیاہ کے دن تم نے گلے لگا کر جن دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا وہ اب تک مجھے یاد ہیں۔ ہائے! کیا سمے تھا وہ بھی۔

سلمیٰ دیدی وہ بات یاد ہے جو تم نے میرے سر پر سونے کا ٹیکہ باندھتے ہوئے کہی تھی، یاد کیوں نہ ہو گی۔ ٹیکہ باندھ کر تم نے مجھے روپ رانی کا خطاب دیا تھا، پھر سینہ ٹھونک کر تم نے کہا تھا کہ دیکھنا کملا تیرا پتی تیرے پاؤں دھو کر نہ پئے تو جو چاہنا مجھے کہنا۔

دیدی! مجھے کیا معلوم تھا کہ میں بھولی کیا جانوں۔ روپ کیا ہوتا ہے، تم نے بتایا تو نہ جانے کیا سمجھ کر میں نے چھپے چھپے آرسی میں اپنا چہرہ دیکھا۔ مجھے تو کچھ بھی روپ نظر

نہ آیا۔ میں وہی کملا تھی جو بیاہ سے پہلے تھی ہاں! جب میں اجیت پور اپنے پتی کے دیس پہنچی تو منہ دیکھنے والوں نے جب چندے آفتاب چندے ماہتاب کہا اور میری ساس نے بلائیں لے کر رائی نون اُتارا تو مجھے اپنے روپ وان ہونے کا گمان ہوا۔ پھر جب میرے پتی نے مجھے دیکھا اور دیر تک دیکھتے رہے تو مجھے یقین بھی ہو گیا کہ شاید میں سلمیٰ دیدی کی "روپ رانی" ہی ہوں۔

لیکن سلمیٰ دیدی! یہی رنگ روپ میری بپتا کا کارن بنا اُس نے میرا سہاگ لوٹا، اور اسی کے کارن میں تباہ و برباد ہوئی میری سندرتا کی دھوم گاؤں بھر میں ہو گئی مورکھ سنگھ نے بھی سُنا، ہائے راکشش مورکھ سنگھ، گاؤں کے بدمعاشوں کا سرگروہ تھا بند اس نے پہلے میرے پتی سے یارانہ گانٹھا مگر تمہارے گھر کی آنے جانے والی کسی قدر پردے کے فائدوں سے بھی واقف تھی، دل میں کالا نظر آیا تو میں نے اپنے پتی سے کہہ بھی دیا کہ مورکھ سنگھ کے تیور اچھے نہیں۔ وہ بھی کچھ چوکنّا ہوئے، لیکن مورکھ سنگھ سے بے رُخی کا نتیجہ اچھا نہ ہوا۔ ایک رات جب ہم لوگ گہری نیندیں سو رہے تھے یکایک دھما دھم کی آواز سے سب چونک پڑے، مورکھ سنگھ اپنے راکششوں کے ساتھ گھر میں پھاندا۔ چار بدمعاشوں نے مجھے پکڑ لیا، باقی میرے پتی پر پل پڑے۔ ہائے میرا پتی بڑی بہادری سے لڑتا ہوا، کملا کملا کہتا مارا گیا۔ دنیا میری نگاہوں میں اندھیری ہو گئی۔ میں روئی پیٹی چیخی چلائی کوئی میری مدد کو نہیں آیا۔ بدمعاش بڑے اطمینان سے مجھے پکڑ لے گئے۔ میں کیا بتاؤں مجھے کہاں لے گئے۔ کہاں اور کیسے رکھا، سپاہی، پیادے، منشی، داروغہ سب مورکھ سنگھ سے ملے ہوتے تھے۔ وہ ڈاکے مارتا، خون کرتا، دوسروں کی کمائی لوٹتا اور گاؤں بھر میں دندناتا پھرتا۔ میں نے جو اسے گالیاں دیں تو بے حیا ہنسا پھر اس نے میرے ساتھ بڑے بڑے ظلم کیے۔ میں دعائیں مانگتی تھی کہ زمین پھٹ جائے۔ میں اس میں سما جاؤں، آسمان پھٹ پڑے کہ وہ

راکشش ناس ہو جائے. مگر سلمیٰ دیدی! نہ آسمان پھٹا، نہ زمین شق ہوئی۔

اُس نے مجھے جس گھر میں بند کر رکھا تھا، میں اس میں گاؤں کے لوگوں کے نام لے لے کر دہائی دیتی، شور مچاتی بھاگتی، مگر مجھے فرار کی راہ نہ ملتی. مورکھ سنگھ مجھے مارتا تھپڑ گھونسے، کوڑے برساتا مجھے اس طرح مارتا جیسے کسی جانور کو مارا جا رہا ہو. مگر میری زبان تو آزاد تھی. میرے جسم کی ساری طاقت سمٹ کر زبان میں آگئی تھی جس کی تیزی تھپڑوں اور کوڑوں سے اور بھی تیز تر ہوتی رہی۔

میں اس کے گھر بہت دن بند رہی، سلمیٰ دیدی! ایشور نے بھی میری پکار نہ سنی دُکھ سہتے سہتے، مار کھاتے کھاتے اور تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ ایک دن رات کے بارہ بجے مجھے اُس کے گھر سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس کے لوگ کئی اور کنیاؤں کو کہیں سے پکڑ لائے تھے، سب اُن کی طرف متوجہ تھے، میں نظر بچا کر بھاگ نکلی. میں بھاگ کر اپنے پتاجی کے پاس آئی۔ ان سے رو رو کر ساری رام کہانی سنائی۔ وہ تھانے گئے۔ یہ کہہ کر گئے تھے کہ رپٹ لکھا کر مورکھ سنگھ کو کالا پانی نہ کرایا تو و دیا دین نام نہیں. لیکن لوٹ کر آئے تو بولے "بیٹا سنسار میں نیائے نہیں ہے۔" آن بان والے آدمی تھے. پستول اٹھا کر اس کی نلی کنپٹی سے لگائی اور لبلبی دبا دی۔ ایک دھماکے کے ساتھ وہ زمین پر گرے گولی نے ان کا سر توڑ دیا تھا، دم بھر میں دم بھی نکل گیا۔ وہ تو سورگ کو سدھارے لیکن مجھے پاگل کر گئے. میرا دماغ خراب ہو گیا۔ منھ سے اول فول نکلا تو پاس پڑوس والوں نے ہمدردی کے بجائے مذاق بنا لیا۔ میں اور بپھری، لوگوں کو اور مزہ آگیا. چڑانا شروع کیا آخر لونڈوں اور لفنگوں نے تمہاری کملا کو کھیل بنا لیا ہائے کسی نے انصاف نہ کیا میرے ساتھ. پتاجی کا کہنا سچ ہی ہے. سنسار میں نیائے نہیں، یہاں جس کی لاٹھی اُس کی بھینس. مثال میں مجھے اور مورکھ سنگھ ہی کو دیکھو. ہزاروں خون ہیں اس راکشش کی گردن پر، مگر عیش ہے کہ اس پر نچھاور ہوا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس مجھ کو تم جانتی ہی ہو. سچ کہنا

کون سی برائی ہے مجھ میں مگر کون سا دُکھ ہے جو باقی رہا میرے لیے۔"

کملا اپنی بپتا سنا کر خاموش ہوگئی۔ اُدھر اس نے آنسو پونچھے ادھر میں نے، جب ذرا افاقہ ہوا تو میں نے کہا "مگر کملا! تم تم ہی ہو، اور وہ وہی نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے۔ نیک اور بد یکساں نہیں ہو سکتے۔" کملا میری اس بات پر جز بز سی ہوگئی "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں مشکل نیکوں ہی کو ہے، بد کے لیے کوئی سزا نہیں۔"

"ہے کیوں نہیں" میں نے فوراً کہا "لیکن اس جیون میں پوری سزا ممکن کیسے ہے؟" کملا نے یہ سُن کر پوچھا "کیا کہا؟" میں نے کہا "پہلے تم یہ بتاؤ کہ مورکھ سنگھ جو ہزاروں خون کر چکا ہے، ڈاکو ہے، بدمعاش اور راکشش ہے اگر تمہارے بس میں ہو تو تم اسے کیا سزا دوگی؟" کملا بولی "میں تو اُسے آدھا گڑوا کر زندہ ہی کتوں سے نچوا ڈالوں اور اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دوں۔"

کملا یہ کہہ کر دانت پیسنے لگی۔ میں نے کہا "بس ہزاروں کے خون کا بدلہ، بہو بیٹیوں کی بے آبروئی کا انتقام اَن گنت ڈاکہ زنی کا عوض اس طرح ہو جائے گا؟" میرے اس کہنے پر کملا نے لمبی سانس لی۔ بڑے حسرت سے بولی "بدلہ تو کیا ہو جائے گا، میرے من کو کچھ سنتوش ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "پھر انھیں سنتوش کیسے ہوگا جنھیں وہ موت کے گھاٹ اتار چکا۔ کیا ایک جان لے کر سب کی جان کا بدلہ پورا ہو جائے گا؟"

اب کملا سٹ پٹائی۔ خود مجھ سے پوچھنے لگی "دیدی! تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "میں تو یہ سمجھتی ہوں، سمجھتی ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ مورکھ سنگھ کی سزا کے لیے اسے ایک ایسی زندگی ملنا چاہیے جس کے بعد موت نہ ہو اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایسی سخت سزائیں دی جائیں جن سے وہ کبھی چھٹکارا نہ پائے وہ آگ میں جلایا جائے وہ خوب جلے اور موت مانگے مگر موت نہ ملے۔ اُسے زہریلے بچھو ڈنگ ماریں وہ تڑپے اور مرنے کی دُعا

کرے اور نہ مرے، اسے کھانے کو لہو، پیپ، ناگ پھنی جیسی چیزیں ملیں وہ نہ کھائے تو زبردستی اس کے حلق میں ٹھونسی جائیں جنھیں وہ نہ نگل سکے، اور یہ سب ان لوگوں کے سامنے ہو جنھیں اس نے اس جیون میں خون کے آنسو رُلا رُلا کر ستایا اور برباد کیا ہے۔ جیسے یہ میری کملا۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے میں نے کملا کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا، اُس نے ٹھنڈی سانس لی، بولی۔ ہاں، تب تو بدلہ ہو سکتا ہے سچ مچ دیدی! کیا ایسا دن بھی آئے گا؟" میں نے جواب دیا۔ "کملا! تمہاری عقل کیا کہتی ہے؟" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ایسا دن آنا تو چاہیئے۔" یہ کہہ کر اسے کچھ ایسا اطمینان ہوا کہ چند ہی منٹ میں گہری نیند سو گئی اور میں نے پھر اسے مزید چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔

کمزور بنیادیں

"سُنیے محفوظ صاحب! آج میں صاف صاف آپ سے کہدوں ٹھیک اس وقت جب دوکان پر گاہکوں کا ایک میلہ سا لگ جاتا ہے آپ نماز کے لیے اُٹھ جاتے ہیں، اور پندرہ منٹ کے بعد آتے ہیں۔ میں پندرہ منٹ کے اس عرصے میں دوکان کے دوسرے ملازمین سے کس طرح نپٹتا ہوں، گاہکوں کو کس طرح سنبھالتا ہوں، بکری کا کتنا نقصان ہوتا ہے اور مجھے کیا پریشانی ہوتی ہے؟ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں نے بار بار بند لفظوں میں آپ سے کہا لیکن آپ نے توجہ نہیں دی، میں نے اس خیال سے کہ صاف صاف کہوں گا تو آپ کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے گی، اب تک ضبط کیا۔ میں آپ کو کب کا الگ کر چکا ہوتا، لیکن آپ کی دیانت داری نے، آپ کی محنت نے اور وقت کی پابندی نے ہمیشہ سفارش کی۔ پھر یہ کہ جن لوگوں کے کہنے سے میں آپ کو لایا اُن کا بھی لحاظ ہے۔ لیکن آج میں صاف صاف آپ سے کہے دیتا ہوں۔ آپ شام کے اوقات دوکان کے لیے وقف کر دیں رہی نماز تو آپ اپنے پرائیویٹ وقت میں جتنی چاہیں پڑھیں، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے جب کہ میں نے خود بھی صبح کا

وقت ایشور بھگتی کے لیے وقف کر دیا ہے۔ میں ایک ایشور بھگت کو بہت اچھا آدمی سمجھتا ہوں لیکن ایشور بھگتی کے لیے اطمینان اور فرصت کا وقت ہونا چاہیئے۔

آج مجھے ایک اور بات آپ سے کہنا ہے اور وہ ہے، معاف کیجئے آپ کی داڑھی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہماری دکان پر کتنی تعداد میں کالج گرلس سودا خریدنے آتی ہیں۔ لیکن اکثر آپ کی ڈاڑھی سے بھڑک کر طنزیہ الفاظ کے ساتھ، کچھ منھ بنا کر اور کچھ زیرلب مضحکہ خیز مُسکراہٹ کے ساتھ واپس ہو جاتی ہیں۔ کیا اس سے دوکان کا نقصان نہیں ہوتا؟ آپ اقرار کریں گے کہ یقیناً ہوتا ہے۔ تو پھر آپ کو اس پر غور کرنا چاہیئے۔ داڑھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ وقت کی طرح گزرنے کے بعد واپس نہ آسکے۔ ایشور زمین پر گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکاڑ اُگانے میں بخیل نہیں ہے۔ بڑھاپا آنے پر ڈاڑھی نکلنا بند نہ ہو جائے گی، رکھ لیجئے گا۔ دوکان، نماز اور داڑھی میں کیا نسبت ہے؟ اس سوال پر میں نے بہت غور کیا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مہربانی فرما کر آپ اس پر دھیان دیں، اور کل جب دوکان پر تشریف لائیں اس سے پہلے ان دونوں باتوں کے متعلق اپنے فیصلے سے مطلع فرماویں۔ میں آپ سے یہ بھی کہہ دوں کہ مجھے آپ کی ان دونوں باتوں کے علاوہ اور کسی بات سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

دولت رام سیٹھ نے نہایت صفائی سے اپنے دل کی بات کہہ دی جب وہ چپ ہوئے تو محفوظ نے ایک لمبی سانس لی۔ دوکان کے دوسرے ملازمین جا چکے تھے۔ دوکان کا کچھ کام بڑھانا باقی تھا، اس نے اسے سمیٹا۔ دوکان بند ہوئی۔ سیٹھ کے ساتھ وہ بھی جائے قیام کی طرف چل دیا۔

وہ ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اس کے والد سیدھے سادے مذہبی قسم کے مسلمان آدمی تھے۔ انھوں نے اُسے شروع میں کچھ مذہبی تعلیم دی، پھر سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا۔ محفوظ محنتی لڑکا تھا۔ آٹھویں کلاس میں اوّل آیا تو اسے وظیفہ

ملا، پھر دسویں میں بھی وظیفہ حاصل کیا۔ اس طرح اس نے انٹر تک پڑھا۔ اس کے بعد محض گھریلو مشکلات کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ والد بوڑھے ہو چکے تھے، کام کاج ان کے لیے دوبھر تھا۔ پھر یہ کہ محفوظ کی شادی بھی کر دی گئی۔ اس طرح گھر کا سارا بوجھ اسی کے سر آن پڑا۔ گھر میں ماں، باپ، دو بہنیں، بیوی، یہ پانچ افراد تھے، اور چھٹا خود محفوظ۔ چھ جانوں کی ذمہ داری کے احساس نے اس سے تعلیم چھڑوا دی اور وہ معاش کی تلاش میں رہنے لگا۔

برسرِ کار ہونے میں اُسے زیادہ وقت نہیں لگا۔ دولت رام سیٹھ کا سمدھیانہ اس کے گاؤں میں تھا۔ محفوظ کے والد کے تعلقات سیٹھ کے سمدھی سے بڑے اچھے تھے۔ ایک دن سیٹھ سمدھیانے گئے، باتوں باتوں میں محفوظ کا تذکرہ چھڑ گیا۔ سمدھی کی سفارش سے اسے اپنے ساتھ شہر لے گئے اور اپنی دوکان پر کام سے لگا دیا۔ ساتھ ہی اپنے بڑے سے مکان میں ایک کوٹھری قیام کے لیے دے دی۔ محفوظ نے نہایت محنت اور دیانت داری سے کام کیا۔ سیٹھ نے اس کی محنت اور دیانت داری کی قدر کی۔ ہر سال ترقی دی۔ آج جب کہ سیٹھ نے اس کے کام پر یہ اعتراض کیا تو اس وقت اسے ڈیڑھ سو مل رہے تھے۔ ڈیڑھ سو میں سے پچاس وہ اپنے لیے رکھ لیتا، پچیس روپیہ ماہانہ سیونگ بنک میں جمع کرتا اور پچھتر روپیہ ماہانہ نہایت پابندی سے گھر بھیج دیا کرتا تھا۔

آج جتنی دیر وہ جاگتا رہا سیٹھ کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ صبح اُداس وہ سیٹھ کے ساتھ دوکان کی طرف چلا۔ سیٹھ نے اس سے اپنی کل کی بات کا جواب مانگا۔ اس نے دو تین دن کی مہلت مانگی۔ سیٹھ چُپ رہا۔ جا کر دوکان کھولی۔ ڈاک آئی تو اس میں محفوظ کے والد کا بھی خط تھا۔ سیٹھ نے خط اُسے دے دیا جسے پڑھ کر محفوظ نے پھر سیٹھ کو واپس کر دیا اور غمگین ہو گیا۔

سیٹھ وضعدار آدمی تھا۔ نہایت شریف طبیعت اور تعلقات کو نبھانے والا۔

اس نے اسے ایک ہفتہ کی فوراً چھٹی دی اور سو روپے اپنے پاس سے دیے اور کہا، "جاکر فوراً اپنی ماں کی خبر لو۔ ماں کی بیماری میں کچھ اور ضرورت پڑے تو خط ضرور لکھنا۔"

محفوظ سیٹھ کا بہت ممنون ہوا دوکان سے سیدھا اسٹیشن پہنچا اس نے نہایت بے چینی کے ساتھ راستہ کاٹا، راستہ بھر وہ خدا سے ماں کی صحت کے لیے دعا کرتا رہا۔ لیکن جس وقت وہ گھر پہنچا تو ماں "لب دم" تھی۔ بیٹے نے روتی آواز کے ساتھ ماں کو پکارا، ماں نے آنکھ کھول کر اسے دیکھا، پھر ایک ہچکی لی اور ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئی۔

ماں کی وفات کا اثر سب سے زیادہ اس کے بوڑھے باپ پر ہوا۔ اس عمر میں رفیقۂ حیات کی جدائی اُسے ایسی شاق گزری کہ وہ صاحبِ فراش ہو گیا۔ اس ضعیف العمر کو کھانسی کا روگ تو تھا ہی، روح کو صدمہ پہنچا تو اس کھانسی نے دمے کی شکل اختیار کر لی۔ محفوظ نے بڑے دوڑ دھوپ کی۔ حکیموں اور ویدوں کے طرح طرح کے نسخے استعمال کرائے لیکن افاقہ نہ ہوا اور پندرھویں دن ہی رفیقۂ حیات سے جا ملا۔ محفوظ اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔

بے چارا محفوظ اپنے والدین کا ماتم ہی منا رہا تھا کہ اس کی بہن کو کالرا ہو گیا۔ محفوظ گھر بھر میں اسی کو سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ اسے کالرا ہوا تو اس نے اپنا سب کچھ بیچ کر اُس پر قربان کر دیا۔ ایک دن میں چالیس پچاس روپیہ گاؤں میں خرچ کر دیئے۔ پھر افاقہ ہوتے نہ دیکھا تو پیروں فقیروں سے لو لگائی۔ ان سے تعویذ گنڈے لایا۔ اس پر بھی حالت بگڑتے دیکھی تو مصلیٰ بچھا کر اوراد و وظائف میں مشغول ہو گیا۔ گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگیں، منتیں مانیں، نفلیں پڑھیں، آیتیں پڑھ پڑھ کر دم کیا۔ مگر عزیز بہن بھی اللہ کو پیاری ہو گئی اور محفوظ آہ کر کے رہ گیا۔

محفوظ کو گھر پر دو مہینے ہو گئے۔ حالات کی اطلاع وہ سیٹھ کو دیتا رہا۔ سیٹھ اس کی تنخواہ اسے بھیجتا رہا۔ منی آرڈر کے کوپن پر وہ یہ بھی لکھتا رہا کہ محفوظ اپنی نماز اور داڑھی کے معاملے میں اپنے فیصلے سے آگاہ ضرور کرے۔ لیکن محفوظ کو غموں سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ وہ کچھ فیصلہ کرتا۔ غموں سے افاقہ ہوا تو اس نے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ نماز اور داڑھی کے متعلق اس نے کچھ نہ لکھا۔ اس اطلاع پر اسے بواپسی ڈاک تفصیلی خط ملا۔ خط میں لکھا تھا کہ اگر محفوظ سیٹھ کی باتیں مان لے تو اس کی تنخواہ میں پچاس روپیہ اضافہ کر دیا جائے گا۔ ورنہ وہ اپنے کو سبکدوش سمجھے۔

اس خط کو پڑھ کر محفوظ بہت پریشان ہوا۔ ایک طرف پچاس روپے کی ترقی، اِن کے مقابلے میں نماز اور داڑھی کا مسئلہ۔ محفوظ بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک باورچی خانہ سے "اوع، اوع" کی آواز آئی اور اس کی بیوی نے گھبرا کر اسے پکارا۔ "دوڑیو" وہ بے تحاشا دوڑا۔ اُس کی بڑی بہن کے گلے میں ہڈی پھنس گئی تھی۔ محفوظ نے جاتے ہی بہن کے حلق میں انگلی ڈال دی۔ لیکن ہڈی بُری طرح پھنسی ہوئی تھی، نکل نہ سکی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ شہر سے ڈاکٹری امداد لاتا، بہن نے آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ اس موت پر محفوظ رونے کے بجائے ہنس دیا۔ اور دیکھنے والوں کو اس ہنسی پر بڑی حیرت ہوئی۔ جب لوگوں نے دوسرے دن اس کی داڑھی منڈی ہوئی دیکھی، اور نماز کے وقت وہ گھر کے دروازے پر بیٹھا رہا۔ لیکن نماز کو نہ گیا۔ کسی نے ذرا حیرت کا اظہار کیا تو جیسے برسوں کا بھرا ہوا ہو، اک دم پھٹ پڑا۔ جواب دیا:۔

"کیوں کیا کیا میں نے، چہرے کے ان چند بالوں نے، نماز اور نماز کی اللہ والی آہوں اور نالوں نے اب تک کیا دیا مجھے۔ میری ماں کا انتقال ہوا، باپ فوت ہوا، مری جان سے زیادہ عزیز

بہن اللہ کو پیاری ہو گئی، پھر بھی تمہارے خدا کو رحم نہیں آیا آخر
رہی سہی بڑی بہن آناً فاناً ختم ہو گئی، تم نے دیکھا! کیسے کیسے اوراد و نفل
کا وِرد کیا میں نے، کیسی کیسی نفلیں پڑھیں میں نے، کیسا کیسا خدا کے
سامنے گڑگڑایا، بڑے مخدوم کی چوکھٹ پر بھی ناک رگڑ آیا۔ لیکن
اس ساری محنت کا حاصل ؟ ۔ موت، موت اور پھر موت۔ اب
دیکھو اس کا دوسرا رُخ اُدھر میں نے نماز چھوڑی، داڑھی منڈائی
ادھر ایک دم پچاس روپیہ تنخواہ میں اضافہ ہوا۔ اسے کہتے ہیں نقد
سودا !!!۔۔۔"

سُننے والے مذہبی اور قدامت پرست لوگ تھے۔ زِمِ بُزدِ ہو کر رہ گئے
اور محفوظ اپنی بیوی کو لے کر ملازمت پر روانہ ہو گیا۔ سیٹھ سے ملا تو وہ بہت خوش
ہوا۔

محفوظ داڑھی سے فارغ البال ہوا اور اس کے دل سے نماز کا خیال گیا
تو بہرحال دل کے اس خانۂ خالی کی جگہ پُر ہونا چاہیے۔ اس جگہ کو پُر کرنے کے لیے دُنیا
آگے بڑھی اور محفوظ نے نہایت شوق و ذوق کے ساتھ اس کی پذیرائی کی۔ دنیا نے
خواہشات کی تکمیل کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبے کے زیرِ اثر اب محفوظ نے حصولِ دولت
کو اپنا مقصدِ زندگی قرار دیا۔ اور تن من سے اس میں لگ گیا۔ اس نے سیونگ
بنک کی کتاب نکالی۔ اس میں چند سو روپے نکلے۔ گاؤں جا کر آبائی مکان بیچا ہزار
بارہ سو اس میں ہاتھ آئے۔ بیوی کو آئندہ کی کامیابی کا یقین دلا کر چار چھ سو کا زیور
اس سے حاصل کیا، اور یہ سب سود پر لگا دیا۔ ہر ماہ تنخواہ سے آدھی رقم بچاتا اور اسے
بھی سود پر چلا دیتا۔ دوکان سے جو وقت ملتا وہ سارے کا سارا سودی لین دین
میں صرف کرتا۔

محفوظ ذہین اور محنتی تو تھا ہی، ذہانت کا رُخ مڑا تو اس نے حصولِ زر کے وہ سارے ڈھب اختیار کر لیے جن کے ذریعہ دولت کی دیوی مہربان ہو سکے اور اُن تمام دلچسپیوں سے اجتناب کیا جس میں پیسے کا زیان ہو۔ سینما، جُوا، شراب، یار باشی، عیاشی اور ایسے ہی دوسرے مشاغل سے اس نے پرہیز کیا۔ وہ کہا کرتا یہ سب فضول خرچی کے ذرائع ہیں۔ کام وہ کرنا چاہیے جس سے پیسہ آئے، نہ کہ جائے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ قرآن سر پر رکھ کر جھوٹ بول دینا اور پیسہ حاصل کر لینا اس سے بہتر ہے کہ انسان نماز پڑھ پڑھ کر روتا رہے اور کچھ حاصل نہ ہو۔ سو روپے رشوت دے کر اگر ہزار کا فائدہ ہو تو یہ اُس سے اچھا ہے کہ انسان جنّت کے وعدے پر اپنی جیب سے پیسہ خرچ کر ڈالے۔ وہ کہا کرتا ایک اندھے، لنگڑے، لولے فقیر کو ثواب کے لالچ میں ایک پیسہ دینے سے بہتر یہ ہے کہ اپنے نوکر کے بچے کو دے دے اور پھر نوکر سے دُونا کام کرا لے۔ وہ کہا کرتا، دھوکہ دے کر کسی شخص کی رقم اُڑا لینا اپنی ذہانت کا حق ہے۔ چنانچہ محفوظ کو جھوٹ بول دینے میں، دھاندلی کرنے میں، رشوت کا سہارا لینے میں، اور ایسی ان تمام تدبیروں کے کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا جن کے ذریعے دولت ملنے کی توقع ہوتی۔ ہاں تامّل وہاں ضرور ہوتا۔ جہاں جیل کا خطرہ ہوتا۔ حالانکہ وہ یہ گُر بھی جانتا تھا کہ جیل کے دروازے پر رشوت کا تالہ بھی لگ سکتا ہے۔

وہ ایک سال تک جدوجہد کرتا رہا لیکن اس کے پاس چند ہزار روپیوں سے زیادہ روپیہ نہ ہو سکا، حالانکہ اب وہ لکھ پتی بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن اس نے ایک کالے ناگ کو خواب میں دیکھا۔ اس نے سیٹھ سے باتوں باتوں میں خواب کا تذکرہ کر دیا۔ خواب سُن کر سیٹھ کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے تعبیر بتائی ”خزانہ ملنے والا ہے“۔

اسی سال ربیع کی فصل پر محفوظ نے سیٹھ کو مشورہ دیا کہ گورنمنٹ کو سپلائی کرنے

کے لیے گیہوں کا ٹھیکہ حاصل کرنا چاہیئے۔ سیٹھ نے یہ مشورہ فوراً مان لیا۔ اور محفوظ ہی کو دفاتر کی خاک چھاننے، ٹھیکہ لینے، گندم فراہم کرنے اور اس سے متعلق ساری دوڑ دھوپ کا ذمہ دار بنا دیا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ محفوظ اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اس نے ٹھیکہ میں ایک ہوشیاری یہ کی کہ ربیع کی فصل کے کٹنے سے پہلے ہی کسانوں سے گیہوں خرید لیا، اور ۲۵ فیصدی رقم بھی کسانوں کو دیدی اس طرح اسے گیہوں کی قیمت خرید سے بھی کم دینی پڑی۔ اور وہ زیادہ محنت سے بھی بچ گیا۔ گورنمنٹ کو سپلائی کرنے کے بعد جب اس نے حساب سیٹھ کے سامنے پیش کیا تو سیٹھ خوشی کے مارے جھوم گیا تقریباً ایک لاکھ کا اسے فائدہ ہوا۔ ایک لاکھ کے نفع کے سرور میں اس نے ۳۵ ہزار کی اس رقم پر نظر نہ ڈالی جو ایگریکلچر انسپکٹروں اور اس محکمے کے دوسرے افسیران کو رشوت میں دی گئی تھی۔

یہ کام انجام دے کر محفوظ نے سیٹھ کے یہاں چند دن اور کام کیا، اس کے بعد استعفا دے دیا۔ سیٹھ نے اسے بہت سمجھایا، پرانے تعلقات کا واسطہ دیا، مزید مراعات کی توقع دلائی گئی ہزار روپے کا چیک اسی وقت لکھنے کے لیے تیار ہو گیا کہ لے لے اور اپنا کام چلائے لیکن محفوظ اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنا چکا تھا، وہ نہ مانا اور سیٹھ سے الگ ہو گیا۔

سیٹھ سے الگ ہونے کے بعد اس نے اپنا تمام روپیہ سمیٹا۔ شمار کیا تو پچاس ہزار تھا۔ وہ مسکرایا۔ اب اس نے "محفوظ بنک" کے نام سے نیا کاروبار شروع کیا۔ محفوظ بنک کا مقصد عوام کو مالدار بنانا قرار دیا۔ محفوظ نے اس کا لٹریچر پڑھا۔ انھیں تعجب کے ساتھ بڑی خوشی ہوئی کہ "محفوظ بنک" ایک کے بدلے چار دینے والی ایک کمپنی کے تحت ہے یعنی جو شخص اس میں سو روپے جمع کرے گا اسے چھ ماہ بعد چار سو ملیں گے۔ ایک کے چار کے لالچ میں عوام محفوظ بنک کی طرف بڑھے لیکن چھ ماہ تک

تذبذب کی حالت میں رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنک میں توقع سے بہت کم رقم جمع ہوئی۔ لیکن چھ ماہ بعد جو گنی رقم واقعی دی گئی اور اس کی خبر شہر میں پھیلی تو عوام تو عوام بڑے بڑے اس رو میں بہہ گئے۔ اور پھر محفوظ بنک میں روپے کی بڑی ریل پیل ہوئی اگلی ششماہی میں لاکھوں کا لین دین ہوا۔

دوسرے سال کی دوسری ششماہی میں جب لوگوں کے اندازے کے مطابق محفوظ بنک میں روپے کا سرکولیشن (گردش) ایک کروڑ تک پہنچ چکا تھا۔ تو ایک روز ٹھیک دو بجے رات محفوظ بنک میں آگ لگ گئی۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ ادھر آگ لگی۔ اُدھر باہر سڑک پر ایک دوکان سے سیٹی کی آواز آئی۔ اس آواز کے ساتھ آناً فاناً پولیس کی بھاری تعداد نے بنک کو گھیر لیا۔ اور چند ہی منٹ میں فائر بریگیڈ بھی موقعۂ واردات پر پہنچ گیا۔ جیسے وہ پہلے ہی سے آنے کے لیے بے چین تھا۔ فائر بریگیڈ نے آتے ہی بارش شروع کر دی۔ اس حالت میں پولیس نے ایسی کڑی نگرانی کی کہ بنک کی عمارت سے چڑیا تک باہر نہ جا سکی اس کے بعد اندر جا کر ایک ایسے شخص کو پکڑا جو ایک چور دروازے سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ محفوظ تھا۔ پولیس کی گرفت میں آکر محفوظ نے ایک نظر گرد و پیش پر ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ پولیس کے ساتھ اس کا منیم ناتھورام بھی ہے۔ اس نے ناتھورام سے کچھ کہنا چاہا لیکن پولیس نے روک دیا اور اسے فوراً حوالات بھیج دیا۔ اس کے بعد تمام حساب کتاب کو قبضے میں کیا اور محفوظ بنک کو لاک کر کے پہرہ بٹھا دیا۔

اس کے بعد پہلی پیشی میں جب محفوظ عدالت میں لے جایا گیا تو اس نے عدالت سے درخواست کی کہ اسے ناتھورام سے گفتگو کرنے کا موقع دیا جائے۔ عدالت نے کپتان پولیس کی طرف دیکھا، کپتان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عدالت نے پانچ منٹ کا موقع دے دیا۔

محفوظ اور ناتھو رام میں کسی تمہید کے بغیر یہ گفتگو ہوئی:

"کیا میں نے تم کو ایک لاکھ کی رقم دینے کا وعدہ نہیں کیا تھا؟"

"ضرور"

"تو پھر تم نے میرے ساتھ یہ کیا کیا؟"

"وہی جو تم دوسروں کے ساتھ کرنے والے تھے۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا، جب کہ میں نے تم کو ایک لاکھ دینے کا وعدہ کیا تھا؟"

"اس لیے کہ تم نے وعدہ کیا تھا، اور پولیس نے ایک لاکھ سے زائد رقم نقد دے دی۔"

"یعنی کتنی؟"

"سوا لاکھ۔"

"سوا لاکھ کے لیے تم نے دغا کی؟"

"اس میں دغا کا سوال ہی کیا ایک بچہ جانتا ہے کہ سوا ایک لاکھ سے زیادہ ہوتا ہے۔"

"اچھا میں دو لاکھ دوں گا اپنا بیان بدل دو۔"

"میں اپنا بیان بدل دیتا لیکن مشکل یہ ہے کہ میرا تحریری بیان عدالت میں داخل ہو چکا پھر یہ کہ نقد سودا اُدھار سے بہر حال اچھا ہوتا ہے۔ یہ تو میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔"

"تو اب ممکن نہیں؟"

"بالکل ممکن نہیں۔"

اس گفتگو کے بعد محفوظ چپ ہو گیا۔ عدالت نے ان دن کچھ ابتدائی کارروائی کر کے تاریخ بڑھا دی۔ پولیس نے محفوظ کو لے جا کر پھر حوالات میں بند کر دیا۔

دوسرے دن حوالات میں محفوظ کو مردہ پایا گیا۔ اس کی لاش کے پاس ایک پرچہ پڑا ملا۔ اسے اٹھا کر پڑھا گیا۔ محفوظ نے اپنی خودکشی کا اقرار کرتے ہوئے آخر میں یہ لکھا تھا۔

"ایمان کی سلامتی کے ساتھ بھوکے رہنا اس سے اچھا ہے کہ انسان بے ایمان ہو کر دولت سے کھیلے۔"

اعتماد

سیٹھ، رمیش اور محمود دونوں سے بیزار تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اس مرتبہ ان میں سے کسی کو دورے پر نہ بھیجے گا۔ انھوں نے بھی تو غضب کر دیا تھا۔ ٹی۔ اے اور ڈی۔ اے ملا کر ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار کا حساب دیا اور تین ماہ میں دس دس بارہ بارہ ہزار وصول کر کے لائے اور تقریباً اتنے ہی کے آرڈر۔ کوئی اور ہوتا تو کسی نہ کسی جتن سے دونوں کو ملازمت سے الگ کر دیتا لیکن سیٹھ نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے کام لیا۔ دونوں کو ملازمت پر برقرار رکھا لیکن اب کی بار اس کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی۔ میں جانتا تھا کہ رمیش اور محمود کے بارے میں سیٹھ کو کیا بدگمانی تھی۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا تھا لیکن دونوں کے جس خرچ پر اعتراض ہو سکتا تھا انھیں انڈر لائن کر دیا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ میں بڑی ایمانداری کے ساتھ خرچ کروں گا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں ٹیکسی استعمال نہ کروں گا۔ دو چار فرلانگ جانا ہوگا تو رکشا کا سہارا لینے کے بجائے پیدل چلا جاؤں گا۔ اسی طرح کھانے پینے میں بھی احتیاط سے کام لوں گا۔

اور۔۔ یہ واقعہ ہے کہ میں نے بڑی محنت اور دیانت سے کام کیا۔ دو ماہ میں کام ختم کر کے واپس ہوا تو پچیس ہزار کی رقم وصول ہو چکی تھی اور چالیس ہزار کے آرڈر لایا تھا۔ پھر جب سفرِ خرچ کا حساب پیش کیا تو سیٹھ نے ایک نظر اس پر ڈال کر کہا "واقعی آپ ایماندار اور دیانت دار ہیں۔"

سیٹھ میرے کام سے بہت مطمئن ہوا۔ میرا خیال تھا کہ سیٹھ میری ایمانداری اور

دیانت کا صلہ مجھے نہیں تو میرے بچوں کو ضرور دے گا۔ مجھے اُمید کرنا ہی چاہیئے تھی۔ رئیش اور محمود سے میرا سفر خرچ آدھا اور کام دوگنا تین گنا۔ کیا بڑی بات تھی، سو دو سو بچوں کے نام پر دے دیتا۔ میری دیانت داری کی انتہا یہ تھی کہ میں بچوں کے لیے کچھ بھی نہ لایا تھا۔ جب میں سیٹھ کے پاس سے اُٹھ کر گھر گیا تو بازار سے دو درجن کیلے لیتا گیا تھا۔

یہاں اہلیہ نے دو مہینے بچوں کو یہ کہہ کہہ کر بہلایا تھا کہ اباجان تمہارے لیے ٹافیاں لائیں گے۔ موزے اور بنیان لائیں گے۔ ببلو کے لیے ٹوپا لائیں گے شوکت کے لیے سوئٹر اور منی کے لیے چوڑیاں لائیں گے۔ سب یہ تمنائیں دل ہی دل میں پال رہے تھے۔ دو مہینے کے بعد جب میرے تھیلے سے اہلیہ نے کیلے نکالے تو یکدم یہ آوازیں میرے کانوں میں گونج گئیں "۔ اور امی جان! میری چوڑیاں؟ میرے موزے، بنیان، ببلو کا ٹوپا، شوکت کا سوئٹر؟؟؟"

اہلیہ نے کیلے ایک طرف رکھدتے اور کچھ کہے بغیر چائے بنانے کے لیے باورچی خانے کی طرف چلدیں اور مجھے جو شرمندگی اس وقت ہوئی۔ اسے چھپانے کے لیے یہ کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا کہ "جبتک چائے تیار ہو میں جا کر نماز پڑھ لوں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایمانداری اور دیانت داری کے صلے میں گھر کے اندر میرا سر نیچا ہوا تھا۔

دوسرے سال سیٹھ نے پھر مجھ کو دورے پر بھیجا۔ میں نے جاتے وقت سیٹھ سے کہا کہ اگر آپ ڈیرنس الاؤنس کے لیے ایک مقررہ رقم طے فرما دیں تو زیادہ اچھا ہے۔ سفر میں بعض اوقات بے ضرورت صرف کرنے کو لامحالہ جی چاہتا ہے۔ اگر یہ رقم طے فرما دیں تو میں اس کے اندر ہی خرچ کروں گا۔ ورنہ ڈرتا ہوں کہ کسی موقع پر خواہشات کے دباؤ کو قبول کر لوں"۔ میں نے سوچا تھا کہ اسی مقررہ رقم میں سے اتنا ضرور بچا لوں گا کہ بچوں کے لیے تحفے خرید سکوں گا۔

"مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ آپ جو بھی خرچ کریں گے وہ مجھے منظور ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ نہایت دیانت داری سے خرچ کریں گے"۔ سیٹھ نے جواب دیا

اور میں دورے پر روانہ ہو گیا۔ اس بار میں ساتویں ہفتہ کے اندر ہی واپس آ گیا۔ اور نہایت کامیاب ہو کر آیا۔ وصول شدہ رقم اور آرڈرس اور سفرِ خرچ کا حساب سیٹھ کو دیا۔ سیٹھ نے ایک نظر حساب پر ڈالی "ٹھیک ہے" کہہ کر میری طرف دیکھا اور پھر سفر خرچ کے حساب میں جگہ جگہ میں نے جو "دیگر خرچ" دکھایا تھا اُسے انڈر لائن کر کے نہایت سنجیدگی سے بولا۔ اِس کی تفصیل بھی ہونا چاہئے تھی" پھر اسی سوالیہ انداز میں مجھ سے کہا "یہ دیگر خرچ کچھ تحفہ لانے میں ہوا ہوگا۔ ؟" سیٹھ کا اندازِ گفتگو سوالیہ تھا میری زبان سے "ہاں" نکل گیا اور مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ لیکن میں نے اپنے کو سنبھال کر کہا "میں نے یہ خرچ حساب میں لکھ تو دیا ہے لیکن اسے میں قسط وار ادا کر دوں گا۔"

"تو یہاں سے کاٹ دوں ؟" سیٹھ نے کہا اور پھر میری زبان سے نکلا "جی ہاں"

"جی ہاں" کہہ کر میں گھر چلا آیا۔ گھر میں اہل و عیال بہت خوش نظر آ رہے تھے اس بار دیگر خرچ کی دو سو کی رقم سے میں وہ تمام چیزیں خرید لایا تھا جس کی توقع گھر والوں کو ہو سکتی تھی۔ گھر کے لوگ آج بہت خوش تھے اور میری کیا حالت تھی ؟ آپ خود سوچیں، اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کی کیا کیفیت ہوتی ؟۔

میں سیٹھ کی طرف سے اب کس قدر بددل ہو گیا۔ دو سو کی رقم کون سی بڑی رقم تھی۔ رمیش اور محمود نے اپنے اپنے دوروں پر ہزاروں پار کر دیئے اور سیٹھ نے کچھ نہ کیا لیکن یہ دو سو کی رقم بچّوں کے لیے مجھے نہ دے سکا۔ میں نے دل میں سوچا "سرمایہ داروں کی ذہنیّت ہی ایسی ہوتی ہے، ان سے زبردستی وصول کر لیا جاتے تو یہ کچھ نہیں کہتے، اگر چار پیسے بتا کر لیجئے تو انھیں کھل جاتے ہیں۔"

میں ہر مہینے "خرچ" کی ادائے گی میں بیس روپیہ وضع کرانے لگا۔ جب بیس روپئے دیتا تو میرے دل پر چوٹ پڑتی اور میں ہر مہینے سیٹھ سے دور ہوتا جاتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب سیٹھ بیس روپیہ کاٹ کر مجھے تنخواہ دیتا تو ساتھ ہی میری ایمانداری اور دیانت کو

کو ضرور سراہتا۔

جیسے تیسے یہ سال بھی بیتا۔ تیسرے سال پھر مجھے ہی دورے پر بھیجا گیا۔ اب کی بار میں وہ حبیب حسن نہ تھا جو دو بار پہلے دوروں پر جا چکا تھا۔ اس مرتبہ حبیب حسن کے اندر ایک اور "حبیب حسن" چھپا ہوا ہمراہ تھا جو "دیگر خرچ" کی رقم کا انتقام لینے پر آمادہ کر رہا تھا۔

ہمیشہ کی طرح بڑے بڑے شہروں کی رقم وصول کر کے میں نے بینکوں میں جمع کر دی لیکن چھوٹے چھوٹے مقامات کی وصول شدہ رقم میرے ساتھ تھی۔ یہ تقریباً بارہ ہزار کے نوٹ تھے جو میرے ہینڈ بیگ میں رکھے تھے جب میں یہ رقم لے کر چلا تو اپنے ایک جگری دوست محبوب کو لکھ کر بھیجا کہ وہ فرید آباد کے اسٹیشن پر مجھ سے مل لے۔ محبوب فرید آباد کے اسٹیشن پر آکر ملا۔ میرے خط کے مضمون کے مطابق اس نے ٹکٹ لے لیا تھا۔ وہ دو تین اسٹیشن میرے ساتھ ٹرین پر رہا۔ میں نے اس سے اپنے حالات بتائے۔ پھر جب وہ ایک اسٹیشن پر اتر گیا۔ تو میں نے اپنا ہینڈ بیگ اُسے تھما دیا۔ اس کے بعد اپنی جگہ بیٹھ کر یہ سوچنے لگا کہ سیٹھ سے کیا بہانہ کیا جائیگا۔ میں نے بہانہ سوچ لیا۔ آگے چل کر میں نے ایک پرانا ہینڈ بیگ خرید لیا۔ پھر جب اپنے یہاں پہنچکر اسٹیشن سے سیدھا سیٹھ کے پاس پہنچا اور اس کے سامنے ہینڈ بیگ کھولا تو اس کے اندر ردی کاغذ بھرے ہوئے دیکھ کر ایکطرف میں دم بخود رہ گیا، دوسری طرف سیٹھ حیرت زدہ ہو کر بولا "کیا یہ؟"

کچھ دیر سکوت چھایا رہا۔ سیٹھ نے اس سکوت کو توڑا۔ کہنے لگا "ٹرین پر ہینڈ بیگ بدل گیا شاید؟" یہ سن کر مجھے اطمینان ہوا۔ ایک لمبی سانس لے کر میں نے کہا "جی ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔ راستے میں ایک اسٹیشن پر ایک شخص ایسا ہی ہینڈ بیگ لیے ہوئے میرے ڈبے میں آیا تھا۔ آکر میرے پاس بیٹھا تھا میں ہوشیار اور چوکنا بھی تھا پھر نہ جانے کس وقت میری نظر چوک گئی ... اور میں اداس ہو گیا۔"

حبیب صاحب! آپ گھبرائیں نہیں مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ اس شخص نے آپکو بھانپ لیا تھا اور پھر آپ کے پیچھے لگ گیا۔ خیر جانے دیجئے ایک تجربہ یہ بھی سہی" بڑی سنجیدگی کیساتھ مجھ سے کہا... لیکن اسکے بعد عبرتناک تجربہ جو مجھے ہوا، یہ تھا کہ پھر میں نے محبوب کو کئی خط لکھے مگر میرے اس جگری دوست نے ایک خط کا بھی جواب نہ دیا۔ مجبور ہو کر میں فرید آباد گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ محبوب اپنے گھر والوں کو لے کر کہیں چلا گیا۔

خودکشی

"میں تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھے خودکشی کرنے کا وہ طریقہ بتاؤ جس میں کم سے کم تکلیف ہو" انور نے مجھ سے کہا۔ اور میں اس کا منھ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ اس وقت بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی اُداسی تھی جو میں نے کسی پر طاری ہوتے کبھی نہیں دیکھی۔ اس کی آنکھیں ایسی ڈھلکی ہوئی معلوم ہوتیں جیسے وہ کئی دن سے سویا نہ ہو۔ اُس کے گال کس قدر دھنسے ہوئے اور ہونٹ بالکل خشک تھے۔ اس کی بے چینی محسوس کر کے میں نے پوچھا۔

"آخر ماجرا کیا ہے، تم پر کیا مصیبت پھٹ پڑی کہ اتنے بڑے اقدام کے لیے تیار ہو گئے"؟

"میں تم کو اپنی بپتا سنانے نہیں آیا ہوں"۔ وہ کسی قدر جھنجھلا کر بولا۔ "تم تو مجھے وہ بتاؤ جو میں پوچھ رہا ہوں"۔

"اُف خدایا!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اپنی زندگی سے کس قدر بیزار سا نظر آ رہا ہے انور۔ کاش کہ میں اُسے اُس کے ارادے سے باز رکھ سکوں۔ میں نے بڑی نرمی سے کہا:۔

"انور! میرے دوست!! لاتقنطو من رحمتہ اللہ۔ اللہ کی رحمت سے اتنا مایوس نہ ہو۔ یہ دنیا فانی ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ تم پر جو بھی مصیبت پڑی ہو جسے میں نہیں جانتا یا جسے تم بتانا پسند نہیں کرتے، بہر حال وہ مصیبت بھی فانی ہے۔ زیادہ

دلوں ہرگز نہیں رہ سکتی۔ کیا حرج ہے۔ بتادو۔ ہم تھوڑا سا اس پر غور کرلیں۔ شاید اللہ تعالیٰ کوئی تدبیر نکال دے۔"

"میں کہتا ہوں کہ میرے سامنے وعظ مت کہو۔ اگر تم خودکشی کی آسان تدبیر بتا سکتے ہو تو بتادو ورنہ میں چلا، یہ لو۔۔۔"

وہ کرسی سے اُٹھنا چاہتا تھا کہ میں نے بڑھ کر اُسے پکڑ لیا۔ "نہیں میرے دوست! تم بیٹھو۔ اچھا لو، میں بتاتا ہوں، تم جانتے ہو کہ مجھے خودکشی کا کوئی تجربہ نہیں اور نہ آج وہ لوگ ہی زندہ ہیں جو خودکشی کر چکے۔ پھر بھلا کون تمہارے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دے۔ ہاں صرف قیاس کیا جا سکتا ہے۔ میرا قیاس یہ ہے کہ خودکشی کا کم سے کم تکلیف دہ طریقہ وہ ہے جس میں جلد سے جلد موت واقع ہو جائے۔ اس لحاظ سے اگر انسان اپنے دل پر گولی مارلے تو زیادہ اچھا ہے۔"

"ہوں۔" وہ سر نیچا کر کے کچھ سوچنے لگا۔ میں نے کہا:۔

"انور! شاید تم یہ سوچنے لگے کہ پستول کہاں سے ملے۔ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں خودکشی کے لیے اپنا پستول دے دوں گا لیکن ساتھ ہی میری کچھ شرطیں تم کو ماننا ہوں گی۔"

"وہ کیا؟"

"تمہیں یہ بتانا ہوگا کہ تم نے خودکشی کا ارادہ کیوں کیا؟"

"میں خودکشی کا ارادہ کیوں نہ کروں جبکہ میں دیکھتا ہوں آج کوئی میرا دوست نہیں۔ کوئی میرا ساتھ دینے والا نہیں۔ بیوی ہے، وہ میرا کہنا نہیں مانتی۔ مجھ سے ذرا ذرا سی باتوں پر لڑتی ہے۔ لڑکے ہیں۔ وہ میری جان لینے پر تُلے رہتے ہیں۔ انھیں اپنی خواہشیں پوری کرنے کے لیے رقم چاہیے۔ وہ باپ کو بینک سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ نہایت بدتمیز، آوارہ، میں کہاں تک انہیں بھروں۔ رشتے داروں میں میری عزت نہیں۔ پاس پڑوس

والے ہر وقت تنگ کرتے رہتے ہیں۔ میں کس کس کو گناؤں، کوئی میرا اپنا نہیں سب کے سب دشمن، سب کے سب بیری، خود غرض، مطلبی درندے۔ ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ میری بوٹی بوٹی نوچ کر کھالے۔ میں بھری دنیا میں رہتا ہوں۔ لیکن اپنے کو بالکل اکیلا پار رہا ہوں۔ کیا یہ سارے حالات خود کشی کرنے کے لیے کافی نہیں اور پھر جب ایک دن مرنا ہی ہے تو اس دن کا انتظار کیوں کروں جس دن خدا نے موت مقدر کی ہے آج ہی کیوں نہ مر جاؤں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس دنیا میں کیوں رہوں، جہاں کوئی میرا نہیں۔"

وہ شاید کچھ اور کہتا لیکن میں نے اُٹھ کر اُسے گلے سے لگالیا۔ "سچ کہتے ہو، میرے دوست انور! اس حالت میں تم کو خود کشی ہی کر لینا چاہئے لیکن کیا اچھا ہوتا کہ تم اپنے دشمنوں سے اس خود غرض دنیا سے، اُن سب سے جو تمہاری موت کی خبر سُن کر خوش ہوں۔ سُنتے ہو انور! میں چاہتا ہوں کہ تم ان سب سے انتقام لے لیتے اور پھر اطمینان سے خود کشی کرتے۔"

"اگر ایسی کوئی تدبیر تم بتا سکو تو تمہارا بڑا احسان مانوں گا۔"

"اچھا تو سنو انور! یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنی جان سے جاؤ اور تمہارے دشمن تمہاری موت کی خبر سُن کر بغلیں بجائیں اور کہیں اچھا ہوا مر گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم زیادہ نہیں صرف ایک ہفتہ خود کشی کا ارادہ ملتوی کر دو۔ اس ہفتہ میں وہ تدبیر کرو کہ جب مرو تو زیادہ سے زیادہ تمہارے دشمنوں کو تمہاری موت کی خبر سن کر دکھ ہو۔ وہ جب سنیں کہ انور مر گیا تو تڑپ جائیں، خون کے آنسو روئیں اپنا سینہ پیٹیں اور تم کو زندہ نہ کر سکیں۔ سچ کہنا، کتنا زبردست انتقام ہو گا یہ۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ تمہارے دشمن تمہارے مرنے کے بعد جب تم کو یاد کریں تو انھیں دلی دکھ ہو۔ بولو، ایسی ترکیب بتاؤں۔

"ضرور بتاؤ، میرے دوست! کاش کہ میں اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکتا!"

"تو پھر تم یہ کرو کہ ان سب سے اپنا رویّہ ایک ہفتہ کے لیے ایسا کر لو کہ وہ دشمنی کے بدلے تم سے محبت کرنے لگیں۔ تم دل میں تو انتقام کی آگ روشن رکھو لیکن ظاہر میں اس طرح ملو جیسے تم ان کے سب سے بڑے خیر خواہ ہو۔ تم ان سب کا دل موہ لینے کی زیادہ کوشش کرو، ہنس کر ان سے ملو، نرمی سے باتیں کرو۔ ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤ۔ تم کو ضرورت ہی کیا ہے انور ایک ہفتہ ہی تو ایکٹنگ کرنا ہے۔ دل میں بیر اور زبان پر خیر۔ بس یہ کردار ایسی خوبی سے ادا کرو کہ لوگ سمجھیں سچ مچ تم ان کی بھلائی چاہنے والے ہو۔ وہ بھی کیا مزے کی بات ہو گی کہ جب کسی اپنے دشمن کو دکھاوے کے طور پر گلے لگاؤ گے اس کی خیریت پوچھو گے۔ اسے جھوٹی دعائیں دو گے۔ وہ سمجھے گا کہ انور اس کا کتنا بڑا دوست ہو گیا ہے۔ اور تمہارا مقصد یہ ہے کہ ایک ہفتہ میں ہر ایک کے لیے اپنی زبان سے اتنا پیار پیش کر دو کہ تمہاری جدائی اُسے تکلیف دینے لگے۔ تم ان دنوں میں اپنی بیوی سے نہایت محبت سے پیش آؤ۔ بچوں کو خوب پیار کر لو۔ رشتہ داروں سے مل کر پچھلی کوتاہیوں کی معافی مانگ لو۔ معافی کا مطلب تم سمجھے نا! تم تو ایک ڈرامہ کرنے چلے ہو۔ بس یہ جھوٹا ڈرامہ اس طرح کرو کہ لوگ سچّا سمجھیں غرض کہ جب تم مرو تو یہ سب تمہاری جدائی میں آٹھ آٹھ آنسو روئیں اور واقعی انھیں تمہارے مرنے کا غم ہو۔ انور! ایک ہفتہ دکھانے کے لیے وہ سلوک کر جاؤ جو تمہارے دشمنوں کو تمہارے بعد اس وقت تک تڑپاتا رہے جب تک وہ زندہ رہیں۔ میرے خیال میں یہ تمہارا وہ انتقام ہو گا جو تمہارے دشمنوں کو بے چین رکھے گا۔ بولو کیا رائے ہے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" انور نے کہا اور اٹھ کر جانے لگا۔

"اچھا تو آج ہی کے دن میں پستول لے کر تمہارے گھر خود آجاؤں گا۔"

"اچھا!"

اچھا کہہ کر انور چلا گیا۔ ساتویں دن جب میں اس کے گھر گیا تو اس نے نہایت ہی خندہ جبینی سے میرا خیر مقدم کیا۔ اس نے زبان اور مال سے جو خاطر تواضع ہو سکتی تھی، کی۔ پھر میں نے اپنا پستول اس کے آگے رکھدیا اور کہا:۔

"دوست! آؤ آخری بار گلے مل لیں۔ پھر تو تمہاری یاد رہ جائے گی۔"

سامنے پستول رکھا دیکھ کر وہ ہنسا۔ اس نے کہا:۔

"اب میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہاری تدبیر کے مطابق جو بناوٹی اخلاق برتا اس سے بڑے خوشگوار نتیجے سامنے آئے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کچھ دن خلوص کے ساتھ اخلاق کا مظاہرہ کروں۔ میرا خیال ہے کہ اگر دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں خلوص بھی شامل کر سلوں تو شاید میری یہی زندگی جنت بن جائے اور مجھے خودکشی کے بجائے زیادہ سے زیادہ دنوں زندہ رہنے کی ہوس پیدا ہو جائے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ تو میں اپنا پستول واپس لے جاؤں؟"

"ہاں میرے دوست! ہاں میرے استاد!"

میں مسکرایا۔ میں نے پستول اُٹھالیا۔ اپنے گھر چلا آیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کا ایک بندہ میری ایک تدبیر کے ذریعہ حرام موت سے بچ گیا۔

(فارسی کی ایک کہانی)

چوک

میرے بڑے بھائی کانپور میں رہتے ہیں۔ میرے بھائی کو بیل بہت پسند ہیں وہ بیل بڑی رغبت سے کھاتے ہیں، کسی قدر رطب سے ربط ہے بیل کھاتے وقت اس کے فائدوں پر لکچر ضرور دیتے جاتے ہیں "پیچش ہو تو بیل کھاؤ اور خوب پیٹ بھر کے کھاؤ اور خوب ہی پیٹ بھر کے کھاؤ۔ اوپر سے خوب پانی پیو۔ گرمی ہو تو بیل کا شربت برف ڈال کر پیو۔ زبان کا چٹخارہ چاہو تو بیل کا مربّہ بناؤ۔ کچّا ملے تو کچّا ہی کھاؤ لیکن بھون کر اگر بچوں کو ڈرانا ہو تو کچّا بیل چولہے کی آگ میں دبا دو۔ تھوڑی دیر میں گولہ سا دغے گا لیکن بھئی اس کے ساتھ چولہے کی بھی خیریت نہیں۔

بھائی صاحب کی تقریر سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ بیل کے کیسے دلدادہ ہیں۔ چنانچہ جب میں رامپور سے کانپور جاتا ہوں کوئی جانے والا ملتا ہے تو کوشش کرتا ہوں کہ کچھ بیل بھیجوں، بشرطیکہ موسم ہو۔

تمہید ختم اب واقعہ سنیئے گذشتہ سال میں کانپور جانے لگا تو بیل لے جانے کی سوجھی۔ منڈی پہنچا اور ایک ڈھیر پر بولی بولی۔ بولی میرے نام ختم ہوئی۔ میں نے مزدور کو بلایا اور اشارہ کیا کہ بیلوں کو بوری میں بھرے اور رکشا تک پہنچا دے۔

مزدور اپنے کام میں لگا۔ اتنے میں میرے پاس کھڑے ہوئے ایک صاحب نے، جو دیر سے کھڑے تھے، مجھ سے کہا "کیا یہ بڑا سا بیل بیچئے گا؟" انھوں نے بیل اٹھا کر مجھے دکھایا اور آٹھ آنے پیسے دام لگائے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ میں نے بیچنے کے لیے بیل نہیں لیے۔" وہ بیچارے اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔ میں بیل لے کر گھر چلا آیا۔

شام کی ٹرین سے روانہ ہوا اور دوسرے دن دوپہر سے پہلے کانپور پہنچ گیا۔

بھائی صاحب سو رہے تھے میں پہنچا تو اچانک میرا نام لے کر چونک پڑے، گویا خواب میں میری آمد کا خواب دیکھ رہی رہے تھے۔ پھر مجھے دیکھ کر پوچھا "بیل لائے!" میں نے سلام کیا۔ جواب سلام کے بعد بیلوں کی طرف اشارہ کیا بس پھر کیا تھا "فلاں تم چلو، اور دیکھو اُسے بلاؤ۔ دو وہاں بھیجدو چار فلاں کے گھر دے آؤ۔ چاقو لاؤ، چمچہ لاؤ" ایک دھوم مچ گئی۔ ہنستے کھیلتے بچے آکر بڑے بھائی صاحب کی دلچسپی میں شریک ہو گئے۔ جن جن گھروں میں جتنے جتنے بیل بھیجنے تھے۔ اِن کے حصے الگ کر دیے گئے دو بڑے سے اپنے لیے مخصوص کر لیے۔ باقی بچّوں اور عورتوں سے کہا "کھاؤ خوب کھاؤ۔ کھا کر خوب پانی پینا" پھر مجھ سے کہا "چلو چلیں کمرے میں"

اپنے حصے کے بیل لے کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ میں پیچھے پیچھے میں تھا کمرے میں پہنچکر۔ دونوں بیلوں کو غور سے دیکھا "خوب ہیں، رنگ بھی اچھا ہے کانپور میں تو ایسا بیل ایک روپیہ کا ایک بیل بھی نہیں مل سکتا۔ کتنے کا ہو گا وہاں رام پور میں۔؟"

"دوکان پر بارہ آنے کو ملے گا لیکن میں نے تو منڈی سے لیا" میں نے جواب دیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک شخص وہیں منڈی میں اس والے بیل کے آٹھ آنے دے رہا تھا"

میں نے اس بیل کی طرف اشارہ کیا۔ زرد زرد بیل بھائی صاحب کے ہاتھ میں تھا اور وہ مسکرا رہے تھے بعد اًوہ سنجیدہ ہو کر بولے "شاید وہ شخص اپنے بچّوں کے لیے خریدنا چاہتا تھا"

"جی ہاں"

وہ یہ بھی جانتا ہو گا کہ تم بیل بیچنے والے نہیں ہو"

ضرور جانتا ہو گا"

"تم سے بڑی چوک ہوئی تمہیں دے دینا چاہیئے تھا اور یہ کہتے ہوتے دینا چاہیئے تھا کہ لیجئے بیل حاضر ہے پیسوں کی کیا ضرورت ہے جیسے آپ کے بچّے ویسے میرے بچے"

یہ کہہ کر بھائی صاحب بیل کو آہستہ آہستہ اُچھالنے لگے۔ اور میں شرم کے مارے پسینے پسینے ہو گیا

"تم نے ایک بڑی نیکی کا موقع کھو دیا" بھائی صاحب نے کہا پھر فرمایا۔

اب جب یاد کرو گے پچھتاؤ گے" یہ بیل توڑا تو وہ بیل اندر سے تقریباً چوتھائی سڑا ہوا تھا۔ بھائی صاحب نے مجھے دکھایا اور میں دم بخود ہو کر رہ گیا۔